

۱۳۰۲



چهارمین



چاند گھن

(ناول)

انتظار حسین

چاند گہن

بوجی سوتے سوتے چونک اٹھیں۔ پہلے تو یوں معلوم ہوا جیسے کوئی ٹھکڑا کر ہنس رہا ہے۔ پھر ایسا سنائی دیا۔ جیسے کوئی کسی کے رونے کی نقل اتار رہا ہے۔ بوجی دم سادھے پڑی رہیں۔ انہوں نے کئی مرتبہ کروٹ لینے کی نیت باندھی لیکن ارادے کے باوجود انہیں اپنے جسم کو جنبش دینے کی ہمت نہ ہوئی۔ انہوں نے گردن کی طرف بھی ہاتھ بڑھانے کا ارادہ کیا تھا انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی گردن پر کوئی چھینٹی بہت آہستہ آہستہ رینگ رہی ہے وہ گردن کھبانا چاہتی تھیں لیکن ہاتھ کو جنبش نہ ہوئی۔ ان کا جسم لکڑی بن گیا تھا۔ انہیں یوں لگ رہا تھا کہ ان کی ساری رگیں ایک ایک سن ہو گئی ہیں اور ان کے بدن کو کسی نے شکنجہ میں کس دیا ہے وہ ہلنا چاہتی تھیں اور ہل نہیں سکتی تھیں۔ البتہ ان کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ سارا جسم سن تھا اور دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا اور کان ان بے نام پر اسرار آوازوں کو گرفت کرنے میں مصروف تھے جن کی کوئی آواز نہیں ہوتی۔ پھر ایک ایک درخت کے پتے اک ڈرا کھڑکھڑائے اور ایک پرندے کے اڑنے کی آواز پیدا ہوئی جو دور دور ہوئی گئی دور ہوئی گئی۔ یہاں تک کہ بالکل معدوم ہو گئی۔ پھر سناٹا چھا گیا۔ بوجی بہت دیر تک دم بند کئے آنکھیں پتے لپٹی رہیں۔ اس وقت اگر کوئی چراغ لے کر انہیں دیکھتا تو عجیب حالت میں پاتا۔ چہرے کا رنگ پیلا ہلکی پڑ گیا تھا۔ کان تو بدن میں لہو نہیں۔ گویا ان کی روح قبض ہو گئی ہے اور خالی جسم کا ڈھانچہ پڑا ہے جس میں ملک الموت کی کسی چوک کی وجہ سے ایک دھڑکتا ہوا تادل پڑا رہ گیا ہے۔ بڑی دیر کے بعد ان کی ذرا جان میں جان آئی۔ ہمت کر کے انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ چہل کا درخت سر نیوڑھائے چپ چاپ کھڑا تھا اس کے پتے ایسے گھنے نہیں تھے۔ پھر بھی انہیں یہ وہم ہوا کہ کوئی ان میں چھپا بیٹھا ہے۔ یہ کوئی کون ہو سکتا ہے۔ کوئی انسان یا کوئی اور مخلوق یہ ان کی سمجھ میں تو اس وقت آتا جب وہ سمجھنے پہ مائل ہوتیں۔ بس انہیں تو کسی کی موجودگی کا ایک مبہم سا احساس تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد انہیں یوں محسوس ہونے لگا کہ اس کی ہر شاخ میں کوئی چھپا بیٹھا ہے اور انہیں جھانک جھانک کر دیکھ رہا ہے۔ بار بار سر نکال کر انہیں دیکھتا ہے اور پھر جلدی سے پتوں کی اوٹ میں ہو جاتا ہے۔ دوسرے تو انہوں نے واقعی ایک کالے سے سر کو تیزی سے پتوں کی اوٹ میں گم ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ دوسووں نے انہیں گھیر لیا تھا۔ ہزاروں طرح کے گمان اور سینکڑوں قسم کے وہم ان کے اندر گھڑ دوڑ کر رہے تھے۔ وہ اگلے ہاتھ پر کروٹ لیے پڑی تھیں اور سلطان کی چار پائی ان کے سیدھے ہاتھ پر تھی۔ لیکن اس کے باوجود انہیں صاف نظر آ رہا تھا کہ اس چار پائی کے قریب کیا ہو رہا ہے۔ چار پائی کے سر ہانے

کوئی چیز رنگ رہی تھی۔ اس کا کوئی جسم نہیں تھا۔ کوئی شکل و صورت نہیں تھی۔ بس ایک سیاہ سایہ تھا جو آہستہ آہستہ رنگ رہا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس سائے نے واقعی ایک جسم کی شکل اختیار کر لی۔ مگر یہ ایک بے شکل جسم تھا۔ اس کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اس میں بیچ و دم نہیں تھے۔ بس ایک ٹھوس جسم تھا اور یہ جسم بسطین پر جھکا جا رہا تھا۔ بوہی نے گھبرا کر ایک ساتھ کروٹ بدلی۔ مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ بسطین بڑے اطمینان سے سو رہا تھا۔ اس کی اطمینان کی نیند کو دیکھ کر بوہی کی گھبراہٹ اک ذرا کم ہوئی۔ اجلا سفید بستر پھولوں سے کڑھا ہوا سفید نرم تکیہ بسطین اطمینان سے سو رہا تھا۔ ایک سفید چادر اس نے اوڑھ رکھی تھی۔ اس سفید بستر اور سفید چادر کو دیکھ کر بوہی کا تصور پھر بے لگام ہو گیا اور بسطین کا چار پائی کی شکل بدلتی شروع ہو گئی۔ لیکن انہوں نے بہت جلد اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ محض ایک دل دہلانے والے واہمہ سے بچنے کی خاطر انہوں نے بسطین کی چار پائی سے رخ پھیر کر گلشن کی چار پائی پر نظریں مرکوز کر دیں گلشن کی چار پائی ان کی پابختی کی سست میں بھی ہوئی تھی۔ محب قاش کی صورت تھی۔ سوتے جاگتے یکساں غل چاتی تھی۔ پھر بھی اسے ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ بوہی اس کے حلق کی داروغہ بن گئی ہیں۔ زبان بلا نے نہیں دیتیں۔ اس وقت وہ بڑے زور شور سے خراٹے لے رہی تھی۔ خرخرکی آواز سے سارا محن گونج رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے آواز نے یکا یک پلٹا کھایا اور فٹ کی آواز پیدا ہوئی۔ بس یوں معلوم ہوا کہ چلتی گاڑی میں کسی نے یکا یک بریک لگا دیے ہیں اور وہ ایک دمچکے کے ساتھ رک کر کھڑی ہو گئی ہے اور جس طرح ریل گاڑی کے رک جانے پر اسٹیم کی آواز نکلا کرتی ہے کچھ اسی قسم کی آواز گلشن کے منہ سے نکل رہی تھی۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ اور سوسوں کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ بس یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہوا تیزی سے منہ میں داخل ہوتی ہے اور کسی وجہ سے پریشان ہو کر تیزی سے نشتوں کے راستے نکل آتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ عبوری کیفیت ختم ہوئی اور خراٹوں کی آواز پھر باقاعدگی سے بلند ہونے لگی۔ البتہ اس مرتبہ آواز میں کچھ ٹھہراؤ تھا۔ لیکن آثار بتا رہے تھے کہ یہ محض ایسا ٹھہراؤ ہے جو ہر عمل کے آغاز میں ہوا کرتا ہے۔ اس کی تان بالعموم اسی نقطہ پر جا کر ٹوٹنے لگی جس نقطہ پر پہلے جا کر ٹوٹی تھی۔ اتنے میں گھڑوچی پر کچھ کھٹکا ہوا۔ گھڑے کا ڈھکن زمین پر گرا اور کوئی چیز دم سے نیچے کو دی۔ بوہی نے ہڑبھڑا کر گھڑوچی کی طرف دیکھا۔ ایک بلی بڑے محمل سے انداز میں شہلٹی ہوئی بسطین کی چار پائی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بوہی اسے زور سے ڈانٹتا چاہتی تھیں لیکن ان کی آواز بھیج کر رو گئی۔ ان کی زبان سے ایک دہلی سی آواز نکل "بلی" اور بلی سناک سے سواری میں گھس گئی۔

بوہی پر یہ کیفیت جانے کب تک طاری رہی۔ وہ تو اس وقت چونکیں جب مرنے نے ڈر بے کے اندر اپنے پر پھڑپھڑا کر زور سے گھڑوں کوں کی آواز بلند کی۔ مرنے کی اذان نے پورے ڈر بے میں زندگی کی ایک لہر دوڑا دی۔ مرنے کی کٹ کٹ اور پروں کی

پھر پڑا ہٹ کے مدھم شور کو سن کر کچھ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کوئی سیال چیز ابھرتی چلی جا رہی ہے اور تھوڑی دیر میں ڈبے کی چھت چٹنے لگی اور یہ سیال متحرک مادہ یوں اٹل پڑے گا۔ جیسے حضرت نوح کے زمانے میں طوفان کا پانی تھور سے اٹل چڑھا تھا۔ کابک کے ایک دو خانوں سے بھی اس قسم کا بہت دیرسا شور سنائی دیا تھا۔ اس شور میں نغمے سننے جہاں مجھوں اور تھنکھروؤں کی لطیف سی جھنکار بھی ملی ہوئی تھی۔ ایک خانے سے یا غفور یا غفور کی صدا یوں آ رہی تھی۔ جیسے گائے کا دودھ دوہتے وقت ایک لطیف سی آواز کے ساتھ سفید سفید جھاگ اٹھتے چلے جاتے ہیں۔ اب یہ پتہ نہیں کہ یہ مرغ کی اذان کا اثر تھا یا اس وجدان کا جو قدرت کی طرف سے مرغوں کے ساتھ ساتھ کبوتروں کو بھی عطا ہوا ہے۔ پھر جب دور کی کسی سڑک پر اگے کے چلنے اور پھیلنے کے نیچے والے کوئیں میں ڈول پڑنے کی آواز آئی تو بوجی کو یقین ہو گیا کہ دن کے ہنگاموں کا آغاز ہو چلا ہے۔

حوائج ضروری سے فراغت پا کر انہوں نے وضو کیا اور نماز پڑھنے کھڑی ہو گئیں صبح کی نماز بہت مختصر ہوتی ہے لیکن دعا بالعموم طویل ہو جاتی ہے۔ بوجی کی دعا میں مدعا تو بہت مختصر الفاظ میں بیان کیا جاتا تھا۔ لیکن وہ واسطے اتنے نبیوں ولیوں اور اماموں کے دیتی تھیں کہ دعا خواہ کواہ طویل ہو جاتی تھی۔ اور آج تو انہوں نے حد ہی کر دی۔ سجدے میں جانے کتنی دیر پڑی رہیں اور گڑگڑا کر دعائیں مانگتی رہیں۔ انہوں نے شاید سجدے میں ہی پڑے رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن وہ تو یہ کہتے کہ انہوں نے گلشن کی آہٹ سن لی اور انہیں محض اس منوس راز کے اظہار کے لیے سجدے کی لذت سے کنارہ کرنا پڑا جس نے ان کے سینے میں کھلی چارکھی تھی۔ انہوں نے سراٹھایا اور جاننا ڈکول پیچھے ہوئے کہنے لگیں۔ اری گلشن اتو نے سنی تھی آواز؟“ اور یہ کہتے کہتے ان کا روئے سخن گلشن کی بجائے آسمان کی طرف ہو گیا۔ الٹی میرے نیچے پر دم کھینچو۔ میں بڑی گتہ کار ہوں۔ بار بار لہا“ گلشن بوجی کی بات اکثر ٹال بھی دیا کرتی تھی۔ لیکن اس وقت تو ان کے چہرے پر ایسی سنجیدگی طاری تھی کہ اسے بھی سنجیدہ ہو جانا ہی پڑا۔ اس نے یہ تو بھانپ لیا تھا کہ معاملہ کچھ بہت زیادہ سنگین ہے۔ لیکن وہ اس کی نوعیت سمجھنے سے قاصر تھی اور کوئی ہوتا تو پٹ سے پوچھ لیتا۔ ”بوجی کیسی آواز؟“ لیکن اس قسم کے سنگین واقعات سے اپنی لاعلمی ظاہر کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھی۔ آخر بوجی خود ہی کھل گئیں۔

”اری پہلے تو میں یہ سمجھی کہ اڑوس پڑوس میں کوئی ہنسا ہو گا مگر میرا ماتھا ٹھک گیا۔ مگر جب اس نے رونے کی نقل اتاری تو میرا تو کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ نہ بی بی اس محلہ میں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ اللہ ہر بلا سے بچائے رکھے۔ جانے کیا ناگہانی آفت آنے والی ہے۔“

گلشن تو اشارے کو چمچی سمجھتی تھی چل نکلی۔ ”اجی بوجی میں سمجھی کہ خواب دیکھ رکھی اوں۔ میرا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ پٹ سے

میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے یو سمجھا کہ پڑوس میں کسی کا بچہ رووے ہے۔ اتنی یہ کجنت جانور تو بڑا منحوس ہووے ہے۔ جس شہر میں بولا ہم نے یو ہی سنا کہ وہ شہر اوہڑ۔“

”اری چپ رہ گلشن۔ تابی بی اس گھر میں ایسا لفظ زبان سے مت نکالو۔“ یو جی خود غیر ارادی طور پر ایسے بد شکونی کے الفاظ ضرور کہہ جاتی تھیں۔ لیکن کسی دوسرے کو انہوں نے بری آواز نکالنے کی کبھی اجازت نہیں دی۔

دراصل یو جی کا ماتھا تو اسی روز صبح کا تھا جب ان کی جوتی پہ جوتی سوار ہو گئی تھی۔ آنکھوں دیکھتے تو کبھی نہیں نگل جاتی۔ گلشن اس کھلی ہوئی حقیقت کی تردید بھلا کیسے کر دیتی۔ وہ ان کی تضحیی کے لیے صرف اس قدر کہہ سکی۔ ”ای جی یو جی سفر تو سبوں کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ بس اوپر والے سے یہ دیا کرو۔ کہ دو جو کرے اچھا کرے۔“ یو جی نے اس جھکے کے سہارے کو غنیمت سمجھا اور چپ ہو رہیں۔ لیکن جب انہوں نے آسمان پر دھار ستارہ دیکھا ان کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ یہ بات ان کی اماں جان نے اپنی خالہ بی سے سنی تھی۔ کہ جب ۵۷ء میں عذر پڑا تھا تو اس سے ایک مہینہ پہلے آسمان پر روز شام کو دھار ستارہ دکھائی دیتا تھا اور ۱۳ء کی جنگ تو خود انہیں بھی اچھی طرح یاد تھی۔ انہوں نے اس زمانے میں خود اپنی آنکھ سے متواتر سات دن تک آسمان پر دھار ستارہ دیکھا تھا اور اس کے بعد انگریز اور جرمن میں وہ خون ٹپھر ہوا کہ خدا کی پناہ۔ البتہ ستارے ٹوٹنے کی روایت صرف عذر سے مخصوص تھی۔ یہ روایت بھی انہوں نے اپنی اماں جان ہی سے سنی تھی۔ اب جب انہوں نے ایک رات کو تار تار تو تین ستارے ٹوٹنے دیکھے تو انہیں بے ساختہ یہ روایت یاد آ گئی اور بولیں۔ ”اللہ اپنا رحم کرے تارے بہت ٹوٹ رہے ہیں۔“ گلشن نے جب اس تلخی کی توضیح طلب کی تو انہوں نے بڑے عالمانہ انداز میں اس کی تفسیروں کی تھی کہ جب دنیا میں کوئی بڑا واقعہ ہونے کو ہوتا ہے تو اللہ میاں اپنے فرشتوں سے مشورہ کرتے ہیں شیطان کنسوتیاں لینے آتا ہے۔ بس اس وقت پہرے والا فرشتہ اس کے پیچھے گرز لے کے دوڑتا ہے۔ یہ ستارہ جب ٹوٹتا ہے تو دراصل یہ گرز ہوتا ہے جو شیطان کے سر پہ پڑتا ہے۔ یوں کام کاج کے سلسلہ میں جب یو جی گلشن کو الزام دیتی تھیں تو گلشن ضرور ان کی تردید کرتی تھی۔ اور کبھی کبھی نوکری چھوڑنے کی دھمکی بھی دے ڈالتی تھی۔ لیکن اس قسم کے الہیاتی مسائل میں تو وہ جھٹ ان پر ایمان لے آتی تھی۔ الو کے بولنے کے سلسلہ میں وہ یو جی پر صرف ایمان ہی نہیں لائی بلکہ کسی نہ کسی طرح اس نے اپنے آپ کو یہ یقین بھی دلایا کہ اس نے خود بھی وہ آواز سنی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ فینڈ کے غلبہ کی وجہ سے وہ اس پر دھیان نہیں دے سکتی تھی۔ بہر حال وہ سبھٹین سے لاکھ درجا اچھی تھی جو یو جی کی کوکھ سے نکلتا تھا اور اس کے باوجود ان کی کسی بات کا یقین نہیں کرتا تھا اور ان کے اشارے کنائے سمجھنے کی تو اس میں سے سے طبیعت ہی نہیں تھی۔ یو جی اپنے آباؤ گھر میں ایسے منحوس جانور کا نام کیسے لے سکتی تھیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتی

تھیں کہ اشاروں کنایوں میں اس کا ذکر کر دیتیں لیکن اگر سہلین کے دماغ میں گور بھرا ہو تو اس کا کیا علاج تھا۔ آخر گلشن نے تھوڑی سی ہمت سے کام لیا اور اس کا نام لینے پر آمادہ ہو گئی۔ لیکن ابھی وہ الف اور ل کی آوازیں ہی نکالنے پائی تھی کہ بوجی نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”ارے لچی کینی ماری تیری زبان کو لقا مارے چٹکی رو۔ تو بڑی آئی بھرے گھر میں اس کا نام لینے والی۔“ لیکن خیر گلشن کا مقصد تو پورا ہو ہی گیا یہ الگ بات ہے کہ سہلین نے اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنے کی بجائے الٹا غریب بوجی کو لٹا ڈیا۔ ”بوجی تم تو بالکل سٹیا گئی ہو۔ بالکل دقیانوسی باتیں کرتی ہو۔“

بوجی واقعی دقیانوسی باتیں کرتی تھیں مجھے شک آ رہا ہے کہ فقرہ تو گویا ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ ہر بات میں شک ہر کام میں شک۔ پتہ کھڑکا اور ان کے کان کھڑے ہوئے الٹی آنکھ مکی اور ان کا دل دھڑکا۔ چکیاں آنی شروع ہوئیں تھیں تو یقین کر لیتی تھیں کہ انہیں کوئی یاد کر رہا ہے۔ اگر کہیں زبان کٹ جاتی تو فوراً گمان گزرتا کہ کوئی ان کی غیبت کر رہا ہے جانور ان کے لیے جانور نہیں بلکہ نیکی اور بدی کے نمائندے تھے۔ کسی سے نیک گلشن لیتی تھیں کسی کو بد حال سمجھتی تھیں اور کسی کو نجاست کی پوٹ تصور کرتی تھیں۔ مرغیاں تو خیر انہوں نے انڈوں کے شوق میں پال رکھی تھیں۔ لیکن کبوتر پالنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ گھر میں فرشتوں اور نیک روحوں کی آمد و رفت رہے۔ سہلین نے جب کتاب پالنے کی نیت باندھی تھی تو اس کی اجازت انہوں نے صرف اس بنا پر نہیں دی کہ جس گھر میں کتا رہتا ہے وہاں فرشتے قدم نہیں رکھتے۔ اس بات کا وہ خاص طور پر اہتمام رکھتی تھیں کہ جمرات کی شام کو کالی بلی یا کالے کتے پر ان کی نظر نہ پڑے۔ صبح کے سلسلہ میں یہ اہتمام بندر کے لیے کیا گیا تھا۔ بوجی کا تجربہ بھی اتنا تھا کہ جب کبھی صبح آنکھ کھلتے ہی بندر نظر آ گیا۔ سارا دن پریشانی میں گزارا۔ سانپ کو زمین کا اور شیر کو جنگل کا بادشاہ سمجھتی تھیں۔ سانپ کے لیے انہوں نے ایک آیت یاد رکھی تھی جس کے اثر سے سانپ اپنی جگہ پر بٹا کا جمارہ جاتا تھا اور جنگل کے بادشاہ کا علاج تو خیر سلمان فارسی نے بتایا رکھا تھا۔ ناؤ بلی اتنی لمبی چوڑی عبارت تو نہ تھی کہ بوجی کو حفظ نہ ہوتی۔ بوجی گڑگڑ کو مارنا ثواب سمجھتی تھیں۔ اگرچہ یہ فرض گلشن یا پھر رفا مردانے سے آ کر انہام دیتا تھا لیکن بوجی بھی سمجھتی تھیں کہ بلی بھر خون ان کا بڑھا ہے اس کے باوجود انہوں نے مرجھا کر حق کی سی شکل اختیار کر لی تھی۔ آندھی ان کے لیے آندھی نہیں بلکہ ستر بلاؤں کا جلوس ہوتی تھی۔ کالی آندھی چلتی تھی تو سمجھ لیتی تھیں کہ شاہ جنات کی سواری نکل رہی ہے زلزلہ آتا تو سمجھتیں کہ گائے نے سیٹک بدلا ہے۔ اس کو وجہ سے زمین مل رہی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ زمین ایک گائے کے سینگوں پر تکی ہوئی ہے۔ کہیں سورج کو لگتا یا چاند کو انہیں صدقہ دینا ضرور تھا۔ صدقے کے علاوہ وہ رخص بلا کی نیت سے دو رکعت نماز بھی بجالاتی تھیں اور گڑگڑا کر دعا مانگتی تھیں کہ ”اٹھی تجھے اپنے حبیب کا واسطہ چاند پہ جو وقت آن پڑا ہے۔ اسے ٹال دے۔“ مختصر یہ کہ بوجی کا

تصور یہ تھا کہ فطرت کے سارے مظاہر نے غریب انسان کے خلاف لام بندی کر رکھی ہے۔ قصبے کے ایک چوتھائی سے زیادہ مکانوں کے متعلق ان کا خیال یہ تھا کہ وہاں پلید رو میں رہتی ہیں۔ نگر شاہ کے احاطہ میں تو سب کچھ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا وہاں پیر جی نگر شاہ کا مزار تھا۔ ایک روز جب وہ وہاں چڑھاوا چڑھانے گئی تھیں تو انہوں نے قبر کے تعویذ میں تازہ تازہ چنبیلی کے پھول رکھے ہوئے دیکھے۔ بوٹی کو تعجب تو اس پر تھا کہ چنبیلی کا موسم نہیں یہ پھول کہاں سے آگئے پھر بقول ان کے ان پھولوں کی خوشبو اتنی تیز تھی کہ ان کا سارا دماغ خوشبو سے پس گیا۔ پھر ایک جمعرات کی شام کو انہوں نے دیکھا کہ ایک سفید نورانی سایہ ہے جو بلند ہوتا جاتا ہے۔ لحد کے قریب پہنچ کر وہ غائب ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی پلید روح نہیں ہو سکتی تھی۔ پلید رو میں اتنی سفید نورانی بھلا کہاں ہوتی ہیں۔ بوٹی نے سمجھ لیا کہ ہونہ ہو یہ خود پیر جی نگر شاہ تھے پاک روحوں سے بھلا کون ڈرتا ہے اس کی وجہ پاس ادب سمجھنے کے بوٹی پھر اس طرف کبھی نہیں گئیں۔ ہاں انہوں نے یہ التزام ضرور برتا کہ ہر جمعرات کی شام کو وہ پانچ پیسے کے بڑے منگا کر گلشن کے حوالے کرتی تھیں اور گلشن بڑی دیانتداری سے بیڑوں کا دو نا نگر شاہ کے مزار پر رکھ آتی تھی۔ بوٹی خود بھی بڑی دیانت دار اور سمجھ دار تھیں۔ جب لوگوں میں یہ چرچا ہوا کہ نگر شاہ کے مزار پر ہر جمعرات کی شام کو تازہ بیڑے رکھے ملتے ہیں تو انہیں بھول کر بھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ خود بھی ہر جمعرات کی شام کو بیڑوں کا دو نا وہاں بھجاتی ہیں۔ یہ خیال انہیں آ بھی کیسے سکتا تھا ان بیڑوں کو جنہوں نے چمکا تھا وہ کہتے تھے کہ ان بیڑوں کا مزہ کچھ بہت ہی عجیب سا ہوتا تھا گویا جنت کا کوئی میوہ کھا رہے ہیں۔ اور کچھ نہ سہی پیر جی نگر شاہ کے طفیل لوگوں کو جنت کے میووں کے مزے کا تو پتہ چل ہی گیا۔

دراصل بوٹی وقت کے بہت بعد پیدا ہوئی تھیں۔ وہ پیدا کسی زمانے میں بھی ہو تیں انہیں مرجانا چاہیے تھا۔ ۲۰ء کے بعد کی حقیقتوں کو انہوں نے کبھی تسلیم ہی نہیں کیا۔ ان کے لیے دنیا کی تاریخ ۵۷ء کے غدر سے شروع ہوتی تھی اور ۱۳ء کی جنگ پر ختم ہو جاتی تھی۔ یوں ان کے ذہن میں ۵۷ء سے پہلے کی تاریخ کا بھی ایک تصور موجود تھا۔ اس میں کچھ پرستان کے قصبے شامل تھے کچھ عالم بالا کی واردات کچھ عرب کے واقعات۔ اور یہ سب کچھ مل کر تاریخ تو انہیں تاریخ کا ایک ملفوظہ سا بن گیا تھا۔ بہر حال یہ تو ماضی کی تاریخ تھی۔ حاضران کے لیے غدر سے شروع ہو کر پہلی جنگ عظیم پر ختم ہو جاتا تھا اور اس سے آگے بس ایک خلا تھا۔ بازار سے دوپٹوں کی طبل غائب ہو جانے اور گیبوں کا توڑا پڑ جانے کی وجہ سے انہیں دوسری جنگ کا تو پتہ چل گیا تھا۔ لیکن انہوں نے اسے ایک بڑے واقعہ کی حیثیت سے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ ایک خوفناک قتل کا حال بھی اکثر ان کی زبان سے سنا گیا ہے۔ یہ قتل بھی ۵۷ء اور ۱۳ء کے درمیان کسی زمانے میں پڑ تھا۔ بنگال کے قتل کا علم تو انہیں ضرور ہو گیا ہوگا۔ لیکن اگر اس نے ان کے تخیل میں ہنگامہ پیدا نہیں کیا تو یہ

قصور واقعہ کا ہونا کہ بوجی کے تخیل کا۔ بنگال کے سلسلہ میں وہ بس ایک ہی اصطلاح سے وقف تھیں۔ بنگال کا جادو۔ بنگال کے کال کی اصطلاح نے ان کے تخیل کے لیے مطلق غذا فراہم نہیں کی۔ بوجی کے دماغ میں شاید یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ جتنے بنگامہ خیز واقعے ہونے تھے وہ ۱۳ء سے پہلے ہو چکے۔ اس کے بعد تو زندگی بس گھٹ گھٹ کر اپنے دن پورے کر رہی ہے۔ البتہ مستقبل کے متعلق انہیں ضرور دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کوئی بنگامہ خیز واقعہ نہ ہو جائے۔ شاید اسی لیے وہ اس مطالعہ میں مصروف رہتی تھیں کہیں کوئی ایسی علامت تو ظاہر نہیں ہوئی ہے جو غدر یا جنگ عظیم سے پہلے ظاہر ہوئی تھی۔ جنگ عظیم سے تو نہیں لیکن غدر سے ضرور چند تلخ یادیں وابستہ تھیں۔ بوجی کے والد واقعی اللہ کے جی تھے اگر انہیں تھوڑی سی بھی عقل ہوتی تو آج ان کی بیٹی کسی ریاست کی رانی ہوتی۔ بوجی نے ہر آنے جانے والے کو یہ بات بتا رکھی تھی کہ غدر کے زمانے میں دلی کے مغل بادشاہ نے ان کے بڑے ابا کی خدمات سے خوش ہو کر انہیں ایک پروانہ لکھ دیا تھا۔ مگر جب دلی میں بھگت ڈہچی تو وہ بھی وہاں سے پیدل چل پڑے۔ پروانہ نیپے میں اڑس کر ایسے بے خبر ہوئے کہ تین دن بعد انہیں پتہ چلا کہ پروانہ کہیں رستے میں گر پڑا ہے۔ بوجی کو یقین تھا کہ اس پروانے میں مغل بادشاہ نے کوئی بڑی سی ریاست بڑے ابا کے نام لکھ دی تھی۔

بڑے ابا تو خیر تھے ہی اللہ کے جی مگر سبھین کے ابا جان بھی کچھ کم نہ تھے وہ خسر سے بھی چار جوتے بڑھے ہوئے نکلے۔ مغل بادشاہ جتنا بڑے ابا پر مہربان تھا اتنا ہی انگریز ابا جان سے خوش تھا۔ اگر انہیں اولاد کا ذرا بھی خیال ہوتا تو آج الغاروں پیسہ ہوتا سبھین سونے میں تلتا اور بوجی رانی بنی راج کرتیں۔ مگر تو یہ کیجئے۔ وہ ایمانداری کی ٹر میں مرے جاتے تھے۔ روکیوں کی بوریاں کی بوریاں لے کر سرحد جاتے تھے اور پٹانوں میں بانٹتے تھے۔ کبھی ایک پائی کی بے ایمانی نہیں کی۔ انگریز ان کی وفاداری اور ایمانداری سے بہت خوش تھا۔ لیکن تھا نرا خشکا۔ تنخواہ تنخواہ تو بڑھائی نہیں خالی خطاب دے کر رخا دیا۔ سبھین کے ابا جان اسی میں خوش تھے۔ مرے تو سارے خطابات سینے پہ دھر کے لے گئے اور جامداد کے نام بس ایک مکان آٹھ دس دوکانیں میں تھیں جگہ زمین اور ساٹھ ہینسلہ ہزار کا بینک کا حساب چھوڑا۔ بوجی نے اس پر بھی خدا کر شکرا کیا۔ ایک حتم اور بیوہ کے لیے روکھی سوکھی روٹیوں کا سہارا تو ہو ہی گیا۔

بوجی نے اپنے یتیم بچے سے بڑی امیدیں باندھی تھیں لیکن اس نے بڑے ہو کر وہ گل کھلانے کہ ان کے سارے ارمانوں پہ اوس پڑ گئی۔ بڑے بوڑھے اسی لیے ہوا کرتے ہیں کہ نوجوان انہیں دیکھ کر حیرت کھڑیں۔ باپ دادا کی غلطیوں سے جو شخص سبق نہ سیکھے اس سے زیادہ بے وقوف کون۔ لیکن بوجی سچ کہتی تھیں کہ ”کسی کا ایک بگڑتا ہوگا دو بگڑتے ہوں گے۔ ہمارا آدکا آداسی بگڑا ہوا ہے۔“ سبھین نے تو وہ مش سچ کر دکھائی کہ باپ پر پوت پتا پر گھوڑا بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ لیکن سبھین کے باپ اور نانا نے دولت نہ کما لی ہو

نام تو ضرور پیدا کیا تھا۔ سرکار دربار میں ان کی وہ پوچھ تھی کہ کیا کسی کی ہوگی۔ اور اباجان نے تو روپیہ کمانے کی طرف کبھی توجہ ہی نہیں کی ورنہ دولت تو ان کی ٹھوکروں سے لگی پڑیں تھی۔ انہیں نام پیدا کرنے کی آرزو تھی سو نام خوب پیدا کیا۔ واسسرائے کے برابر کرسی ملتی تھی۔ خطابات کی ایک پوری قطار نام کے ساتھ نکلی ہوئی تھی۔ انگریز نے اتنا بڑا عہدہ پہلی مرتبہ ایک مسلمان کو دیا تھا۔ آج تک لوگ ان کے مرتبہ اور عزت کو یاد کرتے تھے۔ مگر سبطین اس سے بھی کیا۔ کمانے کھانے کی تو خیر اس میں اہلیت ہی نہ تھی۔ مگر باپ اور نانا دونوں سے زیادہ تعلیم پائی تھی۔ نام تو ضرور پیدا کر سکتا تھا۔ ڈوب یہ پڑ گئی کہ اس نے اپنے آپ کو بھی بدنام کیا اور خاندان کا نام بھی ڈبویا۔ ہوت کے ہیر پالنے میں نظر آ جاتے ہیں۔ سبطین نے دراصل کالج میں ہی ہاتھ پیر پھیلانے شروع کر دیئے تھے۔ جب قسمت بگڑنے پہ آتی ہے تو سوطرغ کے سامان پیدا ہو جاتے ہیں۔ کالج میں سبطین کی فیاض خاں سے ملے بھیلر ہو گئی۔ دونوں میں گاڑھی چھٹنے لگی۔ سبطین کچھ خود بگڑا ہوا تھا۔ کچھ فیاض خاں نے اسے بگاڑا۔ بلکہ بوجی تو سارا الزام فیاض خاں ہی کو دیتی تھیں اور سبطین کو بالکل بے قصور بتاتی تھیں۔ مگر فیاض خاں کے والدین کی روایت یہ تھی کہ فیاض گھر سے اچھا خاصا گیا تھا۔ کالج میں جا کر اسے آوارہ لوندوں کی صحبت ملی بگڑ گیا۔ بوجی کی بھی زیادتی تھی اور فیاض خاں کے والدین بھی غضب کرتے تھے۔ دراصل کوئی کسی کو نہیں بگاڑتا۔ بگڑنے والے خود بگڑ جاتے ہیں۔ جنہیں بگڑنا ہوتا ہے۔ انہیں بھونرے میں پالے تو بھی کسی نہ کسی طرح بگڑ ہی جاتے ہیں۔ جن کی سنبھلی ہوئی طبیعت ہوتی ہے وہ آواراؤں اور بد معاشوں میں رہتے ہیں اور کندن بن کر نکلتے ہیں۔ جیسی روح ویسے فرشتے سبطین جیسا خود تھا ویسا ہی اس نے ساتھی تلاش کیا۔ فیاض خاں کی بھی کالج میں کسی اور سے نہ بنی۔ سبطین سے ملنے بھر کے اندر وہ یوں گھل مل گیا گویا اس سے دوستی کا ٹھننے کے لیے ہی وہ اس کالج میں آیا تھا۔ دونوں کو سلیقہ سے بگڑنا تھا اور اس کے لیے دونوں ایک دوسرے کے محتاج تھے۔

سبطین اور فیاض خاں دونوں نرے جنونی تھے۔ جس بات کی دھت لگتی تھی ایک ہی سی لگتی تھی۔ آوارہ گردی پر آتے تو دن دن بھر اور رات رات بھر گھومتے اور میر نہ ہوتے ہلتوں۔ مہنتوں۔ زمین کا گز بنے رہتے اور ہر اچھی بری جگہ پہنچتے اور شرمناک سے شرمناک اور شریفانہ سے شریفانہ حرکت کرتے۔ جب پڑھنے پر آتے تو ہلتوں ہوٹل کے کمرے میں بند پڑے رہتے۔ رات رات بھر بجلی چلتی اور کتابوں کی ورق گردانی ہوتی۔ یہ کمرہ کیا تھا۔ کتابوں کا اچھا خاصا گودام تھا۔ چار پائی کا کوئی پایہ اونچا ہو جاتا تو بھی کتاب ہی کام میں لائی جاتی اور بستر پر تکیہ نہ ہوتا تو بھی غریب کتابوں پر ہی آفت ٹوٹتی۔ سبطین اور فیاض خاں کمرے سے اکثر غائب رہتے تھے۔ لیکن کمرے میں تالا پڑا ہوا کبھی نہیں پایا گیا۔ بزم خود وہ اپنے کالج میں قلندر کی روایت قائم کر رہے تھے۔ کہتے تھے کہ جو چیز ضائع ہوتی ہے وہ بہر صورت ضائع ہوگی۔ تالا ڈالنا محض الجھڑا ہے۔ لیکن ان کے کمرے میں رکھا کیا تھا جو کوئی چوری کرنے آتا۔

حجرت کا ٹوٹا پھوٹا سامان، سونے چھوٹے کپڑے زردی کاغذ کتابوں کا انبار ان چیزوں کے لیے بھراؤں چوری کی مصیبت سول لیتا۔

سبھتین اور فیاض خاں دونوں کی فکری زندگی کا آغاز اٹھارہ اور بیڑھی ہوئی جماعتوں سے ہو تھا۔ جب ان کے گھروں پر یہ خبر پہنچی تو گھر والوں نے سر پیٹ دیا۔ یونہی اس دن کو روتی تھیں۔ جب انہوں نے لونڈے کو کالج بھیجا تھا۔ لیکن کمان سے تیر لکل چکا تھا۔ اب وہ واپس تو نہیں آ سکتا تھا بوجی بہت روئیں دھوئیں آ خر صبر کر کے بندھ رہی تھیں۔ پہلے تو انہوں نے بیٹے کے عیب پر پردہ ڈانے کی کوشش کی۔ مگر ایسی بات کہیں چھپی رہتی ہے۔ خیالات کا پتہ تلکے میں تو خیر دیر لگتی ہے مگر بڑھی ہوئی حجرت تو دور سے نظر آتی ہے۔ جس نے بھی سبھتین کے ہال بڑھے ہوئے دیکھے انکی اٹھائی اور آ خر کار یہ بھانڈا پھوٹ ہی گیا کہ سبھتین اور سبھتین کا دوست دونوں مذہب سے بھر گئے ہیں اور خدا کو نہیں مانتے۔ سبھتین اور فیاض پہلے دہر پہ کھائے پھر علفی مشہور ہوئے پھر شاعر سمجھے گئے پھر شرابی کہلائے پھر رنڈی باز کا خط بھلا۔ اور آخر میں نان قومی لیڈری پر نوٹی۔ یہ تمام منزلیں انہوں نے بڑی باقاعدگی سے اور بہت سرعت سے طے کی تھیں۔ خدا کے وجود کے مسئلہ کو ایک لایعنی بحث قرار دے کر انہوں نے حیات و کائنات کے مسائل پر غور کرنا شروع کر دیا۔ یہ میدان ایسا ہے کہ آدمی کا قدم ذرا ہلکا جائے تو وہ شاعری کی سرحد میں جا پہنچا ہے۔ سبھتین اور فیاض خاں اپنی چوک پر مطمئن تھے۔ لیکن تھوڑے ہی دن میں شاعری چھوڑ چھاڑ کر پڑھنے لگے۔ پھر ایک ایک انہیں خیال آیا کہ اہل قلم بننا ایسے کون سے کمال کی بات ہے مستانہ جوگی اور مست شہاب رسالوں کے افسانہ نگار بھی اہل قلم کہلاتے ہیں اور اخباروں کے دفاتروں میں جو لوگ خبروں کا انگیزی زبان میں ترجمے کرتے ہیں انہوں نے بھی اپنا نام اہل قلم رکھ چھوڑا ہے۔ قلم کو قلمدان میں رکھ کر انہوں نے تلاش جینی کا شیوہ اختیار کیا۔ ہر کوٹھے پر پہنچے اور ہر حجرے میں شریک ہوئے۔ یکا یک ان پر یہ انکشاف ہوا کہ عورت بازی خاصا پیش پا قدمہ مشغلہ ہے۔ ہوا آدم کے وقتوں سے لوگ اس لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں اور اپنی پٹائی چیز کو پیٹ رہے ہیں۔ وہ بھر بھی اس بازار میں نہیں دیکھے گئے۔ اس کے بعد انہوں نے جو مشغلہ اختیار کیا اس کے بارے میں راویوں کے بیانات بہت متضاد ہیں۔ اس لیے مناسب یہ ہو گا کہ ان پر سرے سے کان ہی نہ دھرا جائے۔ البتہ اتنا طے ہے کہ انہیں بہت جلد یہ احساس ہو گیا تھا کہ جس مشغلہ کو انہوں نے نیا اور انوکھا سمجھا تھا وہ بھی بہت پٹا پٹا یا رستہ ہے۔ اس مشغلہ سے کھٹا کھٹا یا تو وہ پھر کتابوں پہ جھلک گئے اور اس مرتبہ ان پر یکا یک قومی اصلاح کا بھوت سوار ہوا۔ یہ وہ موڑ تھا جہاں سے ان کے رستے قدرے الگ الگ ہوئے ورنہ اب تک تو وہ قدم سے قدم ملانے اس طرح چل رہے تھے کہ ان کی چالوں میں فرق کرنا مشکل کیا ناممکن تھا۔ دونوں عالم فاضل دونوں جنونی۔ لیکن اب دونوں کی حیثیتوں کا فرق وضع ہونے لگا۔ سبھتین تو خرد کی گھنٹیاں سلجھا تارہ گیا۔ لیکن فیاض خاں نے ترقی کر کے ایک مجذوب کی حیثیت اختیار کر لی۔ تھوڑے دن تک اس نے

بھی سبطین کے ساتھ ساتھ قوم کے ردِ مال کے اسباب پر غور کیا تھا۔ لیکن بہت جلد وہ مردِ مجاہد بن کر میدانِ عمل میں اتر آیا۔ یوں عمل کے میدان میں سبطین بھی بعد کو آ گیا۔ لیکن اس کی حیثیت پھر بھی ایک مفکر ہی کی رہی۔ مردِ مجاہد وہ بھی نہ بن سکا۔

سبطین، سبطین سے ڈاکٹر سبطین ہوا اور ہوتے ہوتے پروفیسر ڈاکٹر سبطین بن گیا۔ کالج کے لڑکوں کی طرف سے قبولِ عام کی سند عطا ہوئی۔ دوسرے پروفیسر خوب بن گئے، بن گئے تھے طرح طرح سے اپنی قابلیت کا سکہ جاتے تھے۔ پھر بھی لڑکے ان میں کیڑے ڈالتے تھے وہ نہیں تو نائی کی گرہ پر ہی نکتہ چینی شروع ہو جاتی تھی۔ لیکن پروفیسر ڈاکٹر سبطین کا سب سے بڑا وصف یہی سمجھا گیا کہ وہ ہال بکھیرے خاکی کرتا پانچواں کالج چلے آتے ہیں اور یہی وصف اس کی قابلیت اور طبیعت کی دلیل بن گیا۔ رفتہ رفتہ انہوں نے طلبہ میں ایک ہیرو بلکہ دیوال کی ایک مقصیت کی حیثیت اختیار کر لی۔ فلسفیوں، شاعروں اور مجذوبوں کے جذب و شوق اور قلندر کی ساری روایات ان سے وابستہ کر دی گئیں۔ اگر طلبہ قابلِ اعتبار راوی ہو سکتے ہیں تو پھر کئی ایک لڑکیاں بھی ان پر جان دینے لگی تھیں۔ لیکن انہوں نے اپنی مقبویت سے فائدہ اٹھانا نہ جانا اور پروفیسر چھوڑ چھوڑ کر بیٹہ رہے اور قومی اصلاح کی غرض سے ایک اخبار لکھانے کی ٹھانی۔ رفتہ رفتہ پروفیسر ڈاکٹر سبطین خالی ڈاکٹر سبطین رہ گئے اور پروفیسر کے لفظ کے ساتھ جمع کا صیغہ بھی غائب ہوا (رفیاء کے لیے وہ پہلے بھی سپہ میاں تھے۔ اب بھی سپہ میاں رہا۔)

سبطین نے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور بڑے دھڑلے سے ایک انگریزی اخبار لکھا۔ فیاض خاں کو ایک خط لکھا گیا کہ قوم کو عمل کی کوئی راہ دکھاؤ اور اخبار کے ذریعہ تعلیم یافتہ طبقہ تک اپنی آواز پہنچاؤ۔ فیاض خاں نے شروع شروع میں تو کوئی جواب نہ دیا لیکن جب اس مضمون کے بہت سے خط جمع ہو گئے تو اس نے خط میں سارا قصہ مختصر کر کے یہ شعر لکھ بھیجا۔

مرے لیے ہے خط دورِ حیدری کا
نصیب تجھ کو ملاہوں کی تیزی اور ک

لیکن ڈاکٹر سبطین کی تیزی اور اک خاک کا کام نہ آئی اور اخبار بالآخر بند کرنا پڑا۔ سبطین اس نتیجہ پر پہنچا کہ مسلمانوں کے متوسط طبقہ کو گھن گنگ چکا ہے۔ البتہ مسلمان عوام میں بھی جان بقی ہے اور اگر اسلامی انقلاب کی توقع کی جاسکتی ہے تو انہی عوام سے کی جاسکتی ہے۔ ان عوام تک اپنی آواز پہنچانے کے لیے ایک اردو اخبار کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ اسلامی عوامی انقلاب کی تحریک کی بنیاد اسی گئی اور بڑے ٹھسے سے اخبار ”انقلاب“ جاری کیا گیا فیاض خاں کو مضمون کے لیے پھر زور شور سے خط لکھے گئے۔ اور فیاض خاں نے پھر وہی دو ٹوک جواب دیا کہ قوم کو فکر کی نہیں بلکہ عمل کی ضرورت ہے قوم کو فکر کی واقعی ضرورت نہیں تھی۔ اسلامی عوامی انقلاب کے مجوزہ

نقیب متوسط طبقہ سے بھی بڑی لے گئے۔ چنانچہ ”انقلاب“ کو اتنی عمر بھی نصیب نہ ہوئی جتنی انگریزی اخبار کو نصیب ہوئی تھی۔ آخر پرچے کا ایڈیٹر ایل سبطین نے بڑے خضوع و خشوع سے لکھا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے ہاتھ کانپ رہا تھا ور قلم چل رہا تھا۔ ڈائریٹر ایل کے دور میں تو نہیں لیکن اسے پورا کر چکنے کے بعد ضرور سبطین کو یہ خیال آیا کہ یہ ایڈیٹر ایل مورانا محمد علی کا ایڈیٹر ایل ثابت ہوگا ور ”انقلاب“ کے دفتر میں چند ہوں برے گاجھے کبھی ”بھڑ“ کے دفتر میں اس کی بارش ہوئی تھی۔ بارش کا انتظار کیا گیا لیکن بارش نہیں ہوئی۔ دفتر میں چندے کا کوئی مٹی آرڈر موصول نہ ہوا۔ البتہ وی پی کے چند پرچے ضرور داخل آئے۔ ور سبطین نے اس موقع میں ایک وقت کا کھا نہیں کھایا کہ آخر مورانا محمد علی کے زمانے کے مسلمان کیا ہوئے۔ اس پرچے میں قوم کی بے حسی کا ماتم کرتے ہوئے اعلان تو یہی کیا گیا تھا۔ کہ یہ آخری پرچہ ہے۔ لیکن واقعہ یوں ہے کہ اس کے بعد دو اشاعتیں ور بھی نکلیں۔ یہ نگہ بات ہے کہ وہ گن نہیں بلکہ حل کر نہیں۔

فیاض خاں کا طور کچھ اور تھا۔ باپ کی مارا باندھی سے وہ آئی سی ایس کے امتحان میں بیٹھ گیا تھا اور پاس بھی کر رہا تھا وہ یوں بھی مطمئن تھا۔ اس نے ایک تیر سے دو ٹکار کرنے کی ضمان لی تھی۔ اس کا خیال یہ تھا کہ کلکٹری کی تقریب سے مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کے موقع زیادہ میسر ہوں گے۔ پہلے اس کا مقرر لکھنؤ میں ہوا تھا۔ لیکن اس نے وہاں جانے سے صاف انکار کر دیا۔ دفتری خط و کتابت میں اس نے کچھ ہی عذر پیش کیا ہو مگر بیٹھ کر اس نے یہی کہا کہ لکھنؤ جاکے کیا کروں گا۔ جس شہر کے نو جوان مثنوی زہر عشق پڑھ پڑھ کر زہر کھامیں اور سچے حمیزہ دیکھنے میں مشکلیں سچ ڈالیں اس شہر کے لوگوں سے کسی انقلاب کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس نے کہہ سن کر اپنا تقرر کلکتہ میں کر لیا۔ بنگال مسلمانوں سے اسے بڑی توقعات تھیں لیکن پتہ یہ چلا کہ بنگالی کے مسلمان دہشت پسند مورانا محمد علی کے زمانے کے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ رخصت ہو گئے۔ فیاض خاں نے کلکتہ سے اپنا تبادلہ جنوبی ہند میں کرا لیا۔ سواحل مدراس کے جنوب کے علاقے میں موپلوں کا ایک بڑا اجتماع آباد تھا۔ فیاض خاں کو ان مسلمانوں میں بڑی جان نظر آئی۔ اس نے پورے زور شور سے تنظیم کا کام شروع کر دیا۔ لیکن موپلوں میں جتنی جان تھی اس میں تو لہ مارا کھاتی بھر کا بھی اضافہ نہ ہو البتہ اس کی کلکٹری کی جان پہ بن گئی۔ فیاض خاں نے دن سے استعفا داغ دیا اور جنوبی ہند سے بکٹ لاہور پہنچا۔ پنجاب سے اسے بڑی امیدیں تھیں۔ آخر سرسید نے بھی تو اسی صوبے سے ساری توقعات وابستہ کی تھیں۔ اس نے راستے میں یہ بھی طے کر لیا تھا کہ زندہ دن کا خطاب تو اب خاصا بوسیدہ ہو چکا ہے۔ اب پنجاب والوں کو کسی اور خطاب سے نوازنا چاہیے۔ لاہور پہنچ کر اپنے رہانے کے اس سرسید نے ایک سفرے بے کالج میں پروفیسری کرنی۔ لیکن اصل مقصد تو کچھ اور ہی تھی۔ یہ تو ملاقات کی تقریب نکال گئی تھی۔ مسلمانوں کی جس بستی

میں بھی جائیے اس میں ایک ڈیڑھ مہذب کسی کو نے کھڑے میں پڑا پڑا مل ہی جاتا ہے۔ یہاں فیاض خاں کی مڈ بھڑ منزل سے ہو گئی۔ منزل میں بغیر بننے کی تو نہیں لیکن بغیر کی ناک کابل بننے کی ساری صلاحیتیں موجود تھیں۔ منزل اپنی صلاحیت کی بنا پر فیاض خاں کا سرید ہوا تھا۔ فیاض خاں کا اس میں کچھ کمال نہ تھا۔ فیاض خاں نے لاہور کی ایک ایک گلی اور ایک ایک کوچہ چھان مارا مگر دوسرا سرید اسے نہ ملتا تھا اور نہ ملے۔ آخر لاہور کے بارے میں اسے اپنی رائے بدلتی ہی پڑی۔ اسی زمانے میں اس کے والد مدد مست سے پنشن پا کر اپنے وطن پشاور پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے اسے بلاوا بھیجا۔ لیکن اس نے انہیں لٹکا سا جواب لکھ دیا کہ پٹھان قوم جاہل۔ میری بات نہیں سمجھے گی۔ میں وہاں آ کر کیا کروں گا اس کے بعد اس نے منزل کو اپنا فلسفہ بنا کر لاہور میں چھوڑا اور بستر بوریہ ہاندھہ سرید کے محبوب صوبے سے سرید کے محبوب شہر کا رخ کیا۔ وہاں جا کر اس نے رسل حج میں تالوں کی دوکان کھولی۔ لیکن علی گڑھ نے لاہور کے بھی چونا لگایا۔ یہ تو سرید جائیں کہ وہ مسلمان قوم کو کیا بنانا چاہتے تھے۔ صاحب جنوں یا اہل خرد۔ مگر واقعہ یوں ہے کہ علی گڑھ واسے چلتا پرزہ بن گئے تھے۔ انہوں نے فیاض خاں کو پٹھے پہ ہاتھ ہی نہیں رکھنے دیا۔ دوق جنوں کا ٹوٹا تو لاہور میں بھی تھا لیکن وہاں باگی تو یک مل ہی گیا تھا۔ یہاں باگی بھی میسر نہ آئی۔ البتہ علی گڑھ والوں نے فیاض خاں کے تالوں کی خوب قدر کی۔ یہ بھی عجب عطف رہا کہ ہر جگہ فیاض خاں کا ثانوی کاروبار چلا اور اصل مال کی طرف کسی نے توجہ ہی نہیں کی۔ حسن پوروں نے اس کی تقریروں کے ہل ہاندھے اور کہا کہ پٹھان ہو کے ایسی شست اور رواں اردو بولتا ہے۔ انہوں نے اس کی تقریروں پر داد دہا کی لیکن تقریروں کے موضوع کو گول کر گئے۔ کلکتہ میں کلکٹری خوب چٹکی لیکن لینڈری کا رنگ پھیکا رہا۔ سو پولوں نے اس کے اخلاق اور شرافت کے گن گائے لیکن اس کی تنقیدی صلاحیتوں کا لوہا مانتے سے انکار کر دیا۔ لاہور میں پرو فیسری خوب چلی مگر تبلیغ کی دال نہ گلی۔ علی گڑھ والوں نے تاملے ہاتھوں سے خریدے لیکن اسلامی حواری انقلاب کے مال کو ہاتھ نہ لگایا۔ فرض فیاض خاں کی اردو دانی سے لے کر قفل سازی تک ہر چیز چل گئی نہ چلی تو اصلاح ورائے لکھنا ہی تحریک نہ چلی۔

دوسرا اسلامپور سے جب نوکری کا پروانہ آیا تو فیاض خاں نے رسل حج کی تالوں کی دوکان میں اسی شان سے تانا بٹا جس شان سے کلکٹری کولات مار کر استعفا داغا تھا۔ یہ سچ ہے کہ سرید کے اصل وطن کو آ زمانے میں مضائقہ بھی کیا تھا۔ فیاض خاں کے سر میں ایک سودا سہا ہوا تھا۔ اس کی خاطر وہ بستی بستی گھومنا اور شہر شہر کی خاک چھانی۔ حسن پور سے کلکتہ، کلکتہ سے جنوبی ہند، جنوبی ہند سے لاہور، لاہور سے علی گڑھ، علی گڑھ سے دلی، فیاض خاں تو واقعی اپنے زمانے کا سید احمد خاں بننے پر تڑپا ہوا تھا۔ رفیانے بڑے مطمئن سے اعلان کیا کہ ”نومیاں دس سالے انگریز کا خدیرا بندہ گی۔“

کالے خاں ہکا بکار رہ گیا۔ عین ہواڑی بھی، ایک مرتبہ تو چونک ہی پڑا لیکن اس میں بے سوچے سمجھے ایمان ماننے کی صلاحیت کم تھی اور پھر یوں بھی انگریزوں سے اسے ہمیشہ سے انس تھا۔ چنانچہ اس نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا اور رفیع کے اعلان کا بڑے کلمیت آمیز انداز میں استقبال کیا۔ "چندو خانے سے سن کے آیا ہوگا ہے۔"

"چندو خانہ تیری جاداد ہے۔ میں اسے ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔"

"تو پھر کسی چڑی مار سے اس کے آیا ہوگا۔" عین نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

تھوڑی بہت دین تو ضرور تیار ہو گئی تھی لیکن رفیا ابھی اپنا آرسودہ داؤں مارنے سے گریز کر رہا تھا۔ چڑی مار کا لفظ سن کے اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ "خراں نے اپنا داؤں ماری دیا۔" مرفی کے اخبار کو چڑی مار بتا دے ہے۔ سارے سپو میاں نے خود اخبار سے پڑھ کر مجھے خبر سنائی ہے۔"

اخبار اور پھر سپو میاں۔ عین غریب بتانے کی طرح منہ گیا۔ دوہری مار سے تو، جسے اچھے نہیں پہنچتے۔ کاسے خاں تو پہلے ہی دار میں کشتہ ہو چکا تھا۔ البتہ عین کے اعتراضات سے اس کے ایماں میں خلل پڑنے کا اندیشہ پیدا ہو چلا تھا۔ لیکن اخبار و سپو میاں کا نام سن کر اس کا تذبذب پھر یقین سے بدر گیا۔

سبٹین کی ذات سے کسی اور کو فائدہ پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو لیکن رفیا کو اس سے فائدہ بہت پہنچا تھا اور جی تو بیٹے کے متعلق ہمیشہ یہی کہتی تھیں کہ "بلی کا گوہے پہنانہ پوتنا۔" لیکن اسے مبالغہ آرائی سمجھنا چاہیے۔ خدا تعالیٰ نے اسکی چیز کوئی پیدا نہیں کی ہے جس کا کوئی مصرف نہ ہو۔ یہ سچ ہے کہ سبٹین کی عظمت اور سیاسی سوجھ بوجھ اسلامی موعی انقلابی تحریک کے کام نہ آئی لیکن اس کے دل پر رفیا نے تو اپنی سیاسی بصیرت کے چمکندے گاڑی دیئے عین کی دوکان پر رفیا کے کسی بیان میں جب کبھی بھی کسی رشتہ کا ظہار کیا گیا اس نے وہی، اپنا آرسودہ لسنے سنتاں کیا کہ "سپو میاں یوں کہہ رہے تھے۔" اور اس فقرے کے ساتھ ساتھ سارے اختلافات اور سارے شبہات ختم ہو جاتے تھے دینی معاملات میں تو وہ سبٹین کو بڑی کی تقلید میں واقعی بلی کا گوہتے تھے۔ لیکن اس کے علم و فضل اور اس کی سیاسی باریک بینی کا وہاں فضل حق وکیل سے لے کر عین ہواڑی تک سب ہی مانتے تھے۔ لہذا جب کبھی کسی عامانہ بحث میں رفیا نے اپنے سپو میاں کا حوالہ دیا۔ معترضین کی زبان بند ہو جاتی تھی۔ گویا عین کی دوکان پر بیٹھنے والوں نے سبٹین کو اچھی خاصی صحیح بخاری سمجھ رکھا تھا لیکن صحیح بخاری کے متعلق رفتہ رفتہ محققین نے اس شبہ کا اعتبار کیا کہ اس میں یاروں نے بہت سے غلط حدیثیں بھی شامل کر دی ہیں۔ رفیا کے جو کہ صحت کا ایک دوسرے نہیں متعدد مرتبہ سوال اٹھا تھا۔ رفیا نے بھی غصہ کیا تھا۔ جا بے جا وقت بے وقت سپو

میاں کے وہ تے جو لے دیتا تھا کہ لوگوں کو شبہ ہونے لگا تھا کہ سپو میاں رفا سے کچھ بات بھی کرتے ہیں یا نہیں۔ لیکن رفا بڑے دعوے بلکہ رعونت سے کہتا تھا کہ ”جی جی اس ہے سپو میاں کی کہ میں دن سے پوچھوں اور وہ جواب نہ دیں۔“ دروغ برگردن راوی رفا کی باتوں سے یہی چتا چلتا تھا کہ گھر میں رفا کی بات چلتی ہے۔ اور سپو میاں تو طاقتور کی چیز سمجھے جاتے ہیں۔ دو بونگی کے پہلو سے ضرور پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن وہ آنکھوں کا تار رفا کو سمجھتی ہیں اور یہ کہ سپو میاں کو سوائے رفا سے باتیں کرنے اور اس کے سوالوں کے جواب دینے کے اور کوئی کام نہیں ہے۔ صحن تو تھی ٹکلی۔ اور رفا کا عروج یوں بھی اسے گوارا نہ تھا۔ ایک روز اس نے بھن کر کہہ ہی دیا کہ ”یارے تجھے بچہ رے سپو میاں مل گئے ہیں۔ سیدھے سادے بھولے بھالے۔ دن پہ دھونس بھا لیتا ہے۔ ہوتے اگر ڈپٹی صاحب زندہ تو بچہ چٹکڑی بھول جاتا۔“

رفا بہت پھنپھنایا۔ تاؤ میں آ کر بولا۔ ”بھتی کے ڈپٹی صاحب کا زمانہ بھی دیکھا ہے میاں دے تو میری اسکی خاطر کریں تھے کہ کیا کوئی کرے گا۔ یک دے سپو میاں نے کڑوی بات کہہ دی تھی۔ اکر گیا۔ دن سے ڈپٹی صاحب کو خط لاس دیا کہ میں دلی آ رہا ہوں جی۔ سپو میاں سے میری نہیں ہوتی۔ بس جی چل کھڑا ہوا۔“

”اور سپو میاں نے تجھے جانے دیا؟“ صحن تو قدم قدم پر شک کا اظہار کر رہا تھا۔

رفا طنز آمیز انداز میں ہنسا۔ ”سپو میاں کے فرشتے خاں کو بھی پتہ نہیں چلا۔ بونگی کو میں نے یہ لانا دیا کہ جی سینما دیکھنے جا رہا ہوں۔ س جی میں جودلی پہنچا تو موٹروں کی ایک لین لگی ہوئی تھی۔ ڈپٹی صاحب تھے بڑے رعاب شعاب کے آدمی۔ میرا خط پہنچا تو ویر سے کو کہنا بھیجا کہ ہمارے مٹھی جی آ رہے ہیں۔ سواری بھیج دو۔“

”مٹھی جی“ صحن بے ساختہ کھٹکھٹا کر ہنس پڑا۔

خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پڑتا ہے۔ کالے خاں کی بھی فنی چھوٹ پڑی۔

یہ واقعی رفا کا کمزور پہلو تھا۔ وہ جھینپ گیا اور محض اس جھینپ کو مٹانے کی خاطر اس نے زیادہ زور شور سے اپنا قصہ سنانا شروع کر دیا۔ ”تو بھیا جب میں موٹر میں بیٹھ کے چلا ہوں تو بس یہ سمجھ لو کہ بزار دالے گھور گھور کے دیکھیں تھے اور صدام کریں تھے۔“

”سوچتے ہوں گے کہ دلی میں نیا جناور کونسا آ گیا۔“

رفا صحن کے اس فقرے کو صاف پی گیا اور پھر شروع ہو گیا۔ ”یارے دلی میں بڑی میریں کیں۔ رائے سینا کے برابر جھو محبت

لگی ہوئی تھی۔ رو رہا ہوں پہ جاتا تھا ور قصب صاحب کی لاش پہ چڑھتا تھا۔“

کالے خاں کی "کھنکھیں تارا بن گئیں۔" قطب صاب کی لاش یہ چڑھتا تھا؟

"ہاں بے اور کیا میں جمہوریت انڈے دینے جاتا تھا۔" رفی کو کالے خاں کی جہالت پر اکثر غصا جاتا تھا۔

"سائے پھر تو وہی چھوڑ کے یاں کیوں اسکی کی تھکی کرانے آ گیا؟"

علن کا سوال واقعی نیز تھا۔ لیکن اسے جواب بھی دینا ان شمس ملا۔ یاں تیری اسکی کی تھکی کون کرتا۔" پھر رفیا سہجہ بدلتے ہوئے بڑے سنجیدگی سے بولا۔ "ماں بات یہ تھی کہ ڈپٹی صاب خود مجھے پہنچانے آئے۔ میں نے کہا کہ یہ رفیا جانے بھی دے۔ سپوہاں کو ہی بڑا بن جانے دے مگر فر سپوہاں نے مجھ سے معافی مانگ لی۔"

کبھی علن پھر نہیں پرا۔

علن کی ہنسی نے کام خراب کر دیا۔ کالے خاں پر بھی وہ اثر نہیں ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔

رفیا جھلا پڑا۔ "سائے رفی والے میرا یقین نہیں آتا ست کر تیری اماں گلشن جو ہے اس سے ہا کے پوچھ لے۔"

کالے خاں نے تو فوراً یقین کر لیا۔ علن کہاں تک مقابلہ کرتا۔ آخر اس نے بھی ہتھیار پھینک دیئے۔ کالے خاں نے بھی اس غریب کا آخر وقت تک ساتھ ہی نہیں دیا۔ جہاں ڈرار فی کی آواز میں گرمی آئی اس کی تشکیک کا سارا نشہ ہرن ہو جاتا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ وہ خود بھی سچ بولتا ہے اور باقی سب لوگ بھی سچ بولتے ہیں۔ بھوٹوں کو ساری دنیا بھوٹنی دکھائی دیتی ہے۔ لوگوں کو اس کی پٹھانی تک میں شہ ہو تھا۔ لیکن کسی کی ایک نہ چلی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ایک مرتبہ اپنی پٹھانی پر ایمان سے آنے کے بعد اسے پھر کبھی اس میں شہ نہیں ہوا۔ پھر دوسرے کیا کر لیتے۔ دراصل سچ اور جھوٹ کا تعلق خارجی دنیا سے تو ہے نہیں۔ یہ تو دو الگ الگ ذہنی کیفیتیں ہیں۔ جو بات دیا انداز سے محسوس کی گئی ہے اور مدلی کی شخصیت کا جن بن گئی ہے۔ وہ سچ ہے۔ یہ سوں اٹھنا کہ اس بات نے خارجی دنیا میں ظہور کیا ہے یا نہیں۔ سچ کے تصور کو سچ کرنا ہے اگر کہنے والے کی نیت میں فتور ہے ورنہ اس کا دعویٰ اس کی شخصیت کا جز نہیں بن سکا ہے تو اس کا خارجی دنیا میں لاکھ وجود ہو۔ وہ کھلا ہوا جھوٹ ہی رہے گا۔ ممکن ہے کالے خاں دن کی لیتا ہو مگر بولتا تھا وہ سچ۔ آخر اتنے سید کہاں سے آ گئے۔ اصل بات یہ ہے کہ خاندان میں سے سمجھنے لگتا ہے۔ کالے خاں کے لیے پٹھانی دین ایمان کا معادہ تھی وہ اس کے خوب میں رچی ہوئی ہو یا نہ ہو اس کی ذہنیت میں ضرور بس گئی تھی۔ پٹھانی اس کی شخصیت ہی کا نہیں اس کے نام کا بھی جز بن چکی تھی۔ اب یہ کون کہہ سکتا تھا کہ کالے خاں ایک زمانے میں کالے خاں نہیں بلکہ کھوٹا۔ اس زمانے میں، اگر کوئی ٹھکانے کا ہر سانیات ہوتا تو کالے خاں کے نام پہ تحقیق کرنے بیٹھ جاتا اور لاشوں کی شکلیں بدلنے کے متعلق ایک اچھا خاصا نظریہ وضع کر

بیٹا۔ خیر ہے تو یہ لسانیات کا موضوع مگر اشارہ اتنا بتا دینے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے کہ کالے خاں اصل میں کالے خاں نہیں تھا اس کا اصل نام کیا تھا۔ یہ تو شاید کوئی بھی نہ بتا سکے۔ اس کے ماں باپ ضرور بتا سکتے تھے مگر اس کے ماں باپ تھے کہ۔ وہ تو ان شخصیتوں میں سے تھا جن کا کوئی آگاہ چھپا نہیں ہوتا۔ لیکن جو محلوں کی زندگی مازمی جز ہوتے ہیں۔ وہ اسی شہر کا رہنے والا تھا یا کہیں باہر سے آیا تھا کہ اس سے آیا تھا کون تھا آسمان نے مگر تھا یا زمین سے آگاہ تھا۔ اس کے متعلق کسی کو کچھ پتہ نہیں۔ شاید اسی لیے، اسے پٹھان بننے میں کسی خاص وقت کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔ چونکہ وہ کالہ بھنگ تھا اس لیے محلہ والوں نے اسے گلو کہنا شروع کر دیا۔ گلو سے وہ گلو اپنا اور پھر کالے کہلانے لگا۔ ابھی وہ کالے ہی بنا تھا کہ لڑکی شروع ہو گئی۔ سپاہیوں کی بھرتی شروع ہوئی تو اس کا نمبر بھی آ گیا۔ پیدس فوج میں بھرتی ہو کر محاذ پہ لہ گیا۔ مگر بڑا سخت جان لڑائی کر مہج کر مست آ گیا۔ لڑائی سے واپسی پر وہ دو گھنٹے اپنے ساتھ رہا۔ یا۔ سو گھنٹیں اور پٹھانی۔ شروع شروع میں اس نے اپنی زبان میں بھی پٹھانیت پیدا کرنے کی جان توڑ کوشش کی تھی۔ اپنے لیے وہ جمع شکلم کا مسیخہ استعمال کرتا تھا ورہ کی آواز کو بڑے سلیقے سے کھل کر ”ہم“ کو ”ام“ کہتا تھا۔ لیکن اس کوشش میں اس نے منہ کی کھائی۔ رفتہ رفتہ وہ پھر اپنی سیدھی سادی لباس پہننے لگا۔ دراصل محاذ پر اسے پٹھان رجمنٹ کے ساتھ رہنا پڑا تھا اور وہاں پٹھانوں سے وہ ایک نیا جذبہ لے کر گھر پہنچا تھا۔ یوں کالے خاں بن گیا۔ کالہ بھنگ۔ لہا ترنگا۔ بھرے بھرے ڈنڈ۔ یہ لمبی لمبی کالی موٹھیں۔ بر میں خاکی کرتا۔ ہاتھ میں بلم لگی ہوئی رتھی۔ کالے واقعی کالے خاں لگتے تھے۔ جس کسی نے اس کی پٹھانی میں شک کی نیت، ہندوئی کالے خاں لڑنے مرنے پہل گیا۔ لٹھ پونٹے سے دنیا ڈرتی ہے اور اس کی تو یوں بھی شہر بھر میں دھماکے تھے۔ کسی کے سر میں پھوڑ لگتا تھا جو اس سے لڑائی باندھتا کالے خاں کا رنگ تو یہی بتاتا تھا کہ وہ منی کا بیٹا ہوا ہے اور منی بھی دکن والی کالی منی۔ لیکن حراج کے اعتبار سے تو وہ نرا آگ تھا۔ بس یوں بھگو کا انکار خاں کی تھا۔ ذرا سی بات پہ فوں خاں ہو جاتا تھا پھر وہ لڑائی مصلحتی تھی کہ خدا کی پناہ۔ پورے پورے خاندان لالہیاں لے کر نکل آتے تھے اور اس کی لالچی کا گواہ بن کر واپس جاتے تھے۔ شہر کا کونسا تیس مار خاں تھا جس کو اس کی، ٹھی کا تھر یہ نہ تھا۔ سنتے ہیں کہ کالے جب لڑائی پر چلا گیا تھا تو چند سر پھرے تیس مار خانوں نے بہت سراٹھایا تھا۔ ہر بات میں رفیا ور علن کے منہ آتے تھے لیکن جب کالے پٹھا اور اپنی کالے خانی کا اعلان کیا تو یہ سارے تیس مار خاں جھاگ کی طرح چمٹ گئے۔ رفیا اور علن یوں کالے خاں پر فقرہ بازی بھی کر بیٹے تھے اور اس سے ہر طرح سے کمزور ہونے کے باوجود اس پر دھونس بھی جھ پیتے تھے لیکن آڑے وقت میں ہمیشہ اس کے ساتھ لالہیاں تانے ہوئے دیکھے گئے۔ بلکہ وہ تو دراصل جیراں نمی پرند مریدان نمی پرانند والا مضمون کرتے تھے۔ کالے خاں جو کچھ تھا وہ تو تھا ہی۔ اس کی شخصیت کے گرد والہ بننے کا کام زیادہ تر رفیا نے دور قہوڑا بہت علن نے انجام دیا تھا۔ اس کی کالے

خانی کا چرچا کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ غلن نے حسب عادت شروع میں اس کی پختائی میں شبہ ضرور ظاہر کیا تھا۔ لیکن کالے خاں نے ایسے وثوق سے پشاور کا ذکر کیا کہ اسے آخر یقین کرنا ہی پڑا۔ کالے خاں نے اسے یقین دلانے کے لیے یہاں تک کہا تھا کہ فیاض خاں اسی محلہ کا رہنے والا تھا۔ وہ دروازے کا لُج جاتے ہوئے دیکھا کرتا تھا (فیاض خاں کی روایت یہ تھی کہ والد کے ساتھ ساتھ دو سلسلہ تعلیم شروع ہونے سے پہلے ہی پشاور سے چلا آیا تھا)۔

کالے خاں کو شہرت غلن کی دوکان سے حاصل ہوئی۔ غلن کی دوکان کی سادہ کالے خاں کی وجہ سے قائم ہوئی۔ مگر کالے خاں اس دوکان پر ”کرندہ بینہ“ کرتا تو اس کی حیثیت ہی کیا ہوتی۔ اور اگر کالے خاں وہاں آ کر نہ بینہ کرتا تو پھر کہاں جا کر بینہ کرتا۔ اصل بات یہ تھی کہ اس پورے کاروبار میں سرکاری حیثیت نہ تو کالے خاں کو حاصل تھی اور نہ رفیق کو اور نہ غلن کو۔ یہ حیثیت تو دوکان کو حاصل تھی۔ غلن یوں تو ہواڑی ہی کی صف میں گنا جاتا تھا لیکن اگر کوئی یہ پہنچ کر بینہ کہ غلن کی دوکان ہواڑی کی دوکان نہیں ہے تو اسے جھٹانا واقعی بہت مشکل ہو جاتا۔ اس دوکان پر پان ضرور بکتے تھے لیکن شیشے کے ان پہلے مرتہ لوں کو بھی تو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جن میں سے کسی میں مکملش کسی میں چھوڑے کسی میں چھپے کسی میں سوکھی سزی گزدہانیاں ور۔ جانے کس میں کیا بھرا رکھا تھا۔ دراصل ان میں سے زیادہ تر چیزیں روکن کے سلسلہ میں صرف ہوتی تھیں یا پھر رفیق اور کالے خاں دو دو چار چار دے لٹال کر لو لگتے رہتے تھے۔ لیکن ایسے نا عاقبت اندیش بچے بھی تھے جو وقتی گزدہانیاں خرید کر لے جاتے تھے۔ گزدہانیوں میں تو خیر کھیلوں کے فیض کے سوا اور کوئی خاص عیب نہ ہوتا تھا لیکن ریوز یوں سے تو بری طرح تباہ کوئی ہواڑی تھی۔ پھر بھی بعض کامل و درست بچے تعمیر حوائی کی دوکان تک جانے سے گھبراتے اور غلن سے ریوز یا خرید کر لے جاتے جو نام کو ریوز یاں اور اصل میں تباہ کو کو لٹا ہوتا تھا۔ بار آدم کے کی پرانی دہرائی پنڈیوں اور مٹکیوں میں جو دلیس بھری رکھی تھیں۔ وہ خوب بکتی تھیں۔ گاہوں کو یہ شکایت تو ضرور تھی۔ کہ صس کی دالوں میں مٹی ملی ہوئی ہوتی ہے۔ لیکن معاشی مقاطعہ کا خیال وہ کبھی دل میں نہیں لائے۔ البتہ چھوٹوں میں جو ہماری کے خانوں اور علاقوں میں چنی رکھی تھیں اس کے سوا اور کوئی عیب نہیں پایا گیا کہ گروزیادہ جم جانے کی وجہ سے ان کی چمک دمک مہم پڑ گئی تھی۔ چنگلوں کے سلسلہ میں سرے سے اس قسم کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چنگ اڑانے والے بالعموم صرف چنگ سے غرض رکھتے ہیں اور نئی پرانی کا سوال نہیں اٹھاتے۔ غلن کی دوکان میں ایسی چیزیں بھی خاصی تعداد میں تھیں جن کا تعلق خرید و فروخت سے نہیں بلکہ آرائش سے تھا۔ وہ اس گنت بوطیں جن میں رنگ برنگ پانی بھرا رکھا تھا اور جن پر گرد کا خاصا دبیز غلاف چڑھ چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ زیبائش کی غرض سے چنی گئی تھیں۔ نرمس اور شریا کی تصویروں کے علاوہ اس تصویر کا مقصد بھی سوائے آرائش کے اور کچھ نہ تھا

جس میں ایک برہنہ عورت طس کی ایک دھگی بدن پر اپنے سوراخ کو دائرہ ڈال رہی تھی۔ رہا مولانا محمد علی مصطفیٰ کس عطا مہاراجا اور قائد اعظم کی تصویروں کا سوال تو ان کی حیثیت، یک وقت، قادی بھی تھی اور جمالیاتی بھی البتہ گاما بھولا اور گونگے کی تصویریں خالی فون جلال کی مظہر تھیں۔

اس دوکان می گمانے کی وجہ سے بھی تھیں۔ لیکن گنتی گمانے سے فائدہ۔ طس تو پانوں سے لے کر گڑدھانیوں تک ہر سودے کی چیز کو ثانوی حیثیت دیتا تھا۔ اس دوکان کا اصل مال تو کالے خاں اور رفیہ تھے۔ مگر وقت یہ تھی کہ یہ بکاؤ چیزیں نہیں تھیں۔ بس آؤ دیکھ جاؤ جس کسی نے بھی یہاں کھڑے ہو کر رفیہ سے دلی کا حال اور کالے خاں سے پشاور کی خوبیاں سنیں وہ تاریخ کا ایک نیا شعور اور جفر الہی کی معلومات کا ایک نادر خزانہ لے کر واپس ہوا۔ یہ عجیب بات تھی کہ کالے خاں اور طس ایک بھی تھے اور الگ الگ بھی تھے دو ترقی پسندوں سے اس لحاظ سے بہر صورت مختلف تھے کہ ایک سی پھیلی کے چنے پنے ہونے کے باوجود انہوں نے اپنی شخصیتوں میں اور اپنے انداز فکر میں اپنی اپنی انفرادیت قائم رکھی تھی۔ رفیہ جذب دروں کا قابل تھا۔ ہر بات پوری شدت سے محسوس کر کے کہتا تھا۔ طس کا شمار اہل خرد میں ہونا چاہیے جو ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ ایک محسوسات کا بادشاہ تھا دوسرا معقولات کا حلقہ بگوش تھا۔ دور وہ تیسرے شخص کا لے خاں کی شان جلالی کا مظہر تھا اور ذوق یقین کی دوست سے مالا مال تھا۔ بھرت کی دھپسیاں بھی جدا جدا تھیں۔ رفیہ دلی کا دیوانہ تھا۔ کالے خاں پشاور پہ فدا تھا۔ طس انگریز کے نام کا عاشق تھا۔ اس نے انگریز کی آخردم تک حمایت کی۔ لیکن اگر انگریز کی عقل ہی گدی کے پیچھے جا چکی تھی۔ اور وہ خواہ مخواہ ہندوستان سے دامن جہاز کراٹھ کھڑا ہوا تھا تو طس "خرکیا کر لیتا۔ اس نے اپنی سی بہت کی۔ اور رفیہ کے ان سارے بیانات کی جو وہ انگریزوں کی مخالفت میں دیتا تھا تردید کرتا رہا۔

رفیہ نے اخبار اور سپہ میاں کا حوالہ دے کر طس کو وقتی طور پر جواب ضرور کر دیا تھا۔ لیکن کالے خاں کی طرح وہ بے دال کا یوم تو نہ تھا۔ کہ بے سوچ بچار کہنے اس کی بات مان لیتا۔ اس روز اس نے دن بھر اس مسئلہ پر غور کیا اور سارے سیاسی حالات کا تفصیل سے جائزہ لے ڈالا۔ اور آخر معاملہ کی تہ تک پہنچ ہی گیا۔ شام کو جب چوڑی جی تو سب سے پہلی بات جو طس نے کی وہ یہی تھی۔ یہ وقتی حیرت کی بات ہے کہ دوپہر بھر اس نے کیسے ضبط کیا تھا۔ یہی کوٹھا طلب کر کے بولا۔ "رفیہ بے کھل گئی بات۔"

رفیہ کے کان کھڑے ہوئے۔ کالے خاں بھی چونک پڑا۔ "کیسی بات؟"

"بس کھلی گئی بات۔ یار جی بھی اڑتی چیز یا کو بچا پانتے ہیں۔"

رفیہ کے لہجہ میں اک ذرا گرمی پیدا ہوئی۔ "اپنے بھتی کے بات تو بتا۔ خواہ مخواہ دون کی بے رہا ہے۔"

اور اب غل سنبھل کر بولا۔ ”یہ روی انگریز کی بات۔ پتہ نہیں جانتے دے۔ میں جانوں ہوں۔ بہت اڑ گئے باز ہے سارا۔“

”مگر یہاں اب تو اس کی ساری اڑ گئے بازی دہری رو گئی۔ منوں میں بستر پور یا بندہ کیا۔“

غل تڑپ کر بولا۔ ”یہ تو بالکل ڈیوٹ ہے۔ قسم اللہ پاک کی انگریز بہت چار سو میں ہے۔ دس نے دونوں کے دیا سنبھل کے چونا لگایا ہے کہ جینا کو جھٹی کا دودھ یا دآ جائے گا۔“

”کیا چونا لگایا ہے؟“ رلیا تو خیر چونا لگای تھا۔ کالے خاں بھی گوشہ برا آواز ہو گیا۔

”دیکھو نا ہندو مسلمانوں میں جڑ لگائیں ہوئی ہیں۔“ غلن کے چہرے پر ایسی سنجیدگی طاری ہو گئی تھی۔ گویا وہ کوئی بہت بڑا راز افشا کر رہا ہے۔ ”یہ لڑائیاں انگریز کر رہا ہے۔“

”ہٹ ہے۔“ رلیا نے حقارت آمیز انداز میں اسے جھڑک دیا۔

یہ بات اتنی مضحکہ خیز تھی کہ کالے خاں کو بھی اس کا یقین نہ آیا۔ بولا ”ابے سارے غلن تو تو جھوٹ کے گولے لڑھا دے ہے۔“

”اچھا تو مت مانو۔ یک دن خود مان لو گے۔ کہ نائی نائی بال کتنے۔ کہ جی بھمن جی آگے ہی جو آئے جاوے ہیں۔ تو جی ہم بھی یہیں ہیں تم بھی یہیں ہو۔ دیکھ لینا کیا ہوتا ہے۔ پھر ہم پوچھیں گے کہو بچو کیا کہتے ہو۔“

”کیا ہو گا ہے؟“ رلیا نے بظاہر اپنے حقارت آمیز انداز کو برقرار رکھا تھا۔ لیکن دراصل وہ یہ جانتا بھی چاہتا تھا کہ غلن مستقبل میں کیا نظر آ رہا ہے۔

غلن نے بہت سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”جب اچھی طر لڑائی ہو لے گی۔ تو انگریز ہندوؤں مسلمانوں دونوں کو بٹانے کا کہے گا۔ میں کس برتے پر تپا پانی۔ حکومت تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔ پھر دونوں کو خنجر مار کے کہے گا۔ ہنوجی ہندوستان پاکستان دونوں ختم ہیں ہم حکومت کریں گے۔“

”واپے مرفی کے۔“ رلیا بے ساختہ بول اٹھا۔ ”ہندوستان پاکستان دونوں ختم۔ مہ دھوکے آتا۔“

کالے خاں کو بھی شہلی۔ بولا۔ استاد میں ہندوستان کی تو کہتا تھیں ہوں۔ دے ہے بنیا۔ مگر پاکستان سے کڑھکڑی تو وہ اس سارے انگریز کا مار مار کے بھس بھر دے گا۔“

رلیا نے بہت زور شور سے تائید کی۔ ”یہاں اب پاکستان اب دس کے جھانے میں نہیں آتا۔ صاف ہری جھنڈی دکھا دے گا۔ اور پوساے اپنے کرموں کو رو بھیں گے۔“

اس دوران میں شیر و پلہ دار بھی موقعہ و اہدات پر آ پہنچا تھا۔ چند منٹ تک تو اس نے یہ باتیں سنیں اور پھر اس انداز سے گفتگو میں کھنڈت ڈالی گویا اسے اس پرے قفسے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بولا۔ ”لاؤ حلیہ ذریعوں بیڑی پلہ ڈ۔“

شیر و نے بیڑی کا ہنڈل کھول کر ایک بیڑی نکال کر ہونٹوں میں تھامی اور بولا۔ ”انگریز سال تو جاتی رہا اے۔ پر ایک بات بتائے دوں ہوں۔“ اور اس نے بڑے اطمینان سے اپنی بیڑی چلی ہوئی رسی سے لگا کر سلگانی شروع کر دی۔ رقی کا اوپر کا سانس اوپر دور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ علن کو یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں کوئی بات انگریز کے خلاف اس کے منہ سے نہ نکل جائے۔ کالے خاں کو سو فیصد یقین تھا کہ شیر و جو کہے گا پاکستان کے حق میں کہے گا۔ شیر و جب بیڑی سلکا چکا تو اس نے اطمینان سے ایک روکر کا کش پیا اور چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بولا۔ ”بڑا خون خرابا ہوگا۔“

شیر و کے فقرے نے حاضر خواہ ٹر کیا۔ سارے چہروں پر سنجیدگی کی فضا طاری ہو گئی۔ مگر علن اس کا مطلب کچھ اور ہی سمجھا۔ بولا۔ ”ہاں جی انگریز کے پاس مشین گن ہے۔ ایک ایک کو بھون ڈالے گا۔“

شیر و ہنسا کر بولا۔ ”سارے انگریز کو گوئی مارو۔ میں کہہ رہا ہوں۔“ اور نکا یک اس کی آواز میں سرگوشی کا سا انداز پیدا ہو گیا۔ ”ہندو نے بڑی تیار پاں کی ہیں۔“

کالے خاں نے بڑے عقارت آمیز انداز میں جواب دیا۔ ”شیر و سالے تیری تو ابھی سے مہا مرگنی۔ تیار پاں کر لی ہیں کرینے دے اپنے پیٹنگے سے۔“ ساروں نے کالے خاں کو تیس دیکھا ہے۔“

شیر و خاموش کنگھی ہاندھے کالے خاں کو دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ کالے خاں اچھا جانیں کہتے بڑا خون خرابا ہوگا کالے خاں۔“

شیر و نے زور سے بیڑی کا کش بھرا اور دوکان سے خاموش آگے بڑھ گیا۔

اس روز سبھٹین کی بیٹھک میں اتنے لوگ جمع تھے کہ ایک اچھا خاصا سیاسی جلسہ منعقد کیا جاسکتا تھا۔ جمع کرے اور ہاتھیں گھونٹنے کا چمکا سبھٹین کو انقلاب کے بند ہو جانے کے بعد لگا تھا۔ اس زمانے میں تو اخبار کا اتنا کام تھا کہ سرافھانے کی مہلت ہی نہ ملتی تھی۔ پھر یہ کہ دل کا غبار اخبار کے ذریعہ نکلتا رہتا تھا۔ خیالات کا طوفان امتدادی بھاری بھاری ہوا ادارہ یہ یہ لکھ ڈال ”طبیعت ہلکی ہو گئی۔“ اخبار بند ہو جانے کے بعد طبیعت ہلکی ہونے کا یہ راستہ مسدود ہو گیا۔ لیکن سینے کا طوفان اپنے اخراج کے لیے خود کوئی نہ کوئی رستہ پیدا کر ہی لیتا ہے۔ قلم نہیں چلتا تو زبان چلتی ہے۔ زبان نہیں چلتی تو دوسرے اعضا حرکت میں آتے ہیں۔ زندگی ہر صورت حرکت ہے ”انقلاب“ بند ہوا۔ اس کے بند ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی انقلابی عوامی تحریک ٹھپ ہوئی۔ اس کے ٹھپ ہونے کے ساتھ ساتھ سبھٹین کی

ساری سرگرمیاں ختم ہو گئیں۔ اب سبھین تھ اس کی خالی پیشک۔ کام وہاں کچھ نہیں۔ مگر اس صورت حال کو لڑی طور پر جمود تو نہیں کہا جا سکتا۔ عین ہنوز کی مثال لے لیجئے۔ کبھی کسی نے اسے اپنے قہرے سے اٹھتے نہیں دیکھا۔ دن ہورات ہو وقت ہو بے وقت ہو جب دیکھو عین اپنی دوکان میں موجود۔ لیکن اس کے باوجود اس کے زندگی میں حرکت قہی حرارت قہی۔ جہاں کالے حان، دور دنیا آ کر نہیں دور جہاں شیر آ آ کر چکر کاٹے وہاں سے زیادہ حرکت اور حرارت کہاں ہو سکتی تھی۔ چراغ سے چراغ جلا ضرور آیا ہے اور اگر زندگی ارتقا ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے۔ لیکن اس کا کوئی واضح ثبوت موجود نہیں ہے کہ سبھین نے عین کی دیکھ دیکھی یا روں کو جمع کرنا شروع کیا تھا۔ عین اور سبھین میں یوں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ دل کو سمجھانے کا گردنوں سے آتا تھا۔ اپنی ناکامی کی توجیہات کرنے میں دونوں کو کس حاصل تھا۔ محسوسات کی بنیاد پر معقولات کی عمارت کھڑی کرنے کے انھن کام کو دونوں نے آرٹ کی حد تک پہنچا دیا تھا۔ مگر یہ کہنا زیادتی ہوگی کہ سبھین عین کی پیروی کرتا تھا یا عین سبھین کی نقل کرتا تھا۔ اس یوں سمجھئے کہ دونوں کو ایک ہی قسم کا وجدان عطا ہوا تھا اور اس کے شاعرے پر وہ ہمیشہ ایک ہی سمت میں حرکت کرتے تھے۔ سبھین کبھی کسی کے گھر یہ کہے نہیں گیا کہ صاحب آپ ہمارے گھر آیا کیجئے۔ چکا تو جہاں ہوتا ہے۔ چڑیاں خود ہی چلتی جا یا کرتی ہیں۔ پہلے چند پرانے صاحب علموں نے جنہیں پروفیسر ڈاکٹر سبھین کی ذات سے عشق ہو گیا تھا آنا جانا شروع کیا پھر ایک افسانہ نگار کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ پھر محلہ کے ایک وکیل صاحب کو یکا یک القا ہوا کہ ڈاکٹر سبھین قانون کا بھی شاعر ہے۔ اس سے کیوں نہ استفادہ کیا جائے۔ پھر نمبردار صاحب چونکے ورائیں خیال آیا کہ انہیں اپنی بیٹیوں کو کالج میں داخل کرانا چاہیے اور اس سلسلے میں اگر کوئی شخص ان کا ہاتھ بنا سکتا ہے تو وہ ڈاکٹر سبھین ہے۔ محلہ کے ڈاکو نے محض اس بات سے مرعوب ہو کر ڈاکٹر سبھین کے پاس دنیا بھر کے رسالے اور اخبار آتے ہیں بغیر کسی وجہ کے اس کے یہاں اٹھنا بیٹھنا شروع کر دیا یوں شہر کے سارے بچے کو عین کے گرد خود بخود جمع ہو گئے۔ جو شخص بھی زندگی سے بیزار ہوا اور جسے دنیا میں کہیں ٹھکانا نظر نہ آیا اس نے سبھین کے یہاں آنا جانا شروع کر دیا۔ سبھین اسلامی عوامی انقلابی تحریک کی سیاحتی نہ کر سکا لیکن ایسے اس نے بہت سے لوگوں کے درد کا درماں کیا۔ اس زمانے میں ہر احساس پر موت کا احساس غالب آ گیا تھا۔ ہر شخص مایوس اور زندگی سے کچھ بیزار سا نظر آتا۔ ایسے موقعوں پر کسی نہ کسی سہارے کی ضرورت پیش آیا کرتی ہے۔ سبھین نے اس ضرورت کو بڑی خوش اسلوبی سے پورا کیا۔ لوگوں کو ایک سہارا ملے اور سبھین کو یہ امید ہو چلی کہ اب اسلامی عوامی انقلابی تحریک پھیل جائے گی۔

اس وقت بحث ایک بہت نازک منزل پر آ پہنچی تھی۔ سیاسی موضوعات کی ایک طویل فہرست پر سیر حاصل مٹنگو ہو چکی تھی اور ہر مرتبہ آخر میں سبھین کی رائے قطعی قرار پاتی تھی۔ مگر جب گاندھی جی کی شخصیت معرض بحث میں آئی۔ تو حق صاحب نے سبھین کے

نقطہ نظر کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگے۔ ”سبٹین صاحب۔ یوں آپ اس شخص کو کچھ بھی کہیں مگر یہ ماننا پڑے گا کہ وہ اس زمانے کی عظیم شخصیت۔“

حق صاحب کا فقرہ ختم ہو گیا۔ لیکن سبٹین کی سگریٹ کا کش کچھ اور زیادہ طویل کیا۔ سگریٹ کا کش ختم کر لینے کے بعد بھی اس نے بولنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

نمبردار صاحب نے اس واقعہ کو قیامت جانا۔ بولے ”بھئی بات یہ ہے کہ یہ اس شخص کا ہی دم ہے کہ ہندوستان میں آج مسلمان زندہ ہیں۔ ورنہ۔“

حق صاحب کو جوش آ گیا۔ نمبردار صاحب کا فقرہ کانٹے ہوئے بولے۔ ”یہ واقعہ ہے صاحب اب دیکھیے وہ شخص دلی میں خود میواتیوں کے کیمپ میں گیا۔“

”بہت بڑا آدمی ہے صاحب۔“ نمبردار صاحب ٹھنڈا سا ناس بھرتے ہوئے بولے۔

سبٹین بدستور سگریٹ کے کش لیتا رہا۔ وہ تو غنیم کو پیش قدمی کا پورا پورا موقع دیتا تھا اور پھر اچانک ٹوٹ پڑتا تھا۔

حق صاحب کے بوجہ میں رقت پیدا ہو گئی۔ ”یہ حقیقت ہے کہ اس شخص کے دل میں انسانیت کا بڑا درد ہے۔“

”اس بصیرت افروز حقیقت کا حساس آپ کو کیا ایک مہینہ کی صبح کو ہوا تھا۔“

حق صاحب پیپے ہی حملہ میں بڑبڑا گئے۔ جیسے تیسے کر کے انہوں نے اپنے آپ کو سنبھال اور جواب دینے کی نیت باندھی۔ مگر سبٹین تو پے در پے حملوں کا قائل تھا چلتے چلتے ایک اور وار کر دیا۔ ”حق صاحب ۱۵ اگست کے بعد آپ پر حقیقتوں کا تابڑ توڑ زبردل ہو رہا ہے۔ اس کیمپ کو آپ کہاں لٹکوا دیں گے۔“

حق صاحب سمجھے تو خیر کیا تھے۔ لیکن جواب تو بہر صورت ضروری تھا۔ بولے۔ ”سبٹین صاحب۔ آپ کا یہ طنز نازیبا ہے۔ گاندھی جی کے سیاسی نظریات سے مجھے اختلاف تھا مگر ان کی شخصی عظمت کا میں ہمیشہ معترف رہا۔“

”اب سیاسی نظریات کے بھی معترف ہو گئے؟“

اس فقرے پر حق صاحب شپٹائے تو بہت۔ لیکن انہوں نے ہوسان بجا رکھے اور اقرار اور انکار دونوں سے پہلو ہٹا کر ایک تیسرا راستہ نکالا۔ ”دیکھئے اس اعتراف یا اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ زمانہ بدل چکا ہے بعض نئی حقیقتیں ہمارے سامنے آ رہی ہیں اور انہیں ہمیں قبول کر لینے کی کوشش کرنی چاہیے۔“

”بس ایک گھونٹ پانی کی ضرورت ہے“ سبطین کا لہجہ بظاہر بہت دھیمہ تھا۔ ”آپ ان گولیوں کو حلق سے نیچے اتار ہی میں گے۔ حق صاحب آپ کے ہاتھ پر مجھے رشک آتا ہے۔“

نمبردار صاحب بحث کو دوسرے رستوں پہ بہک جانے کی اجازت دینے پر آمادہ نہ تھے۔ بحث کو اصل موضوع پر لانے ہوئے بولے۔ ”اب گاندھی کی وسعت قلب کا“

”وسعت قلب؟“ حیدر کیہ قسمی غیر متوقع طور پر چونکا۔ اب تک وہ صرف سنے کا فرض انجام دے رہا تھا۔ ”آپ تو جی یہ کہتے تھے کہ گاندھی بڑا متعصب اور تنگ نظر“

نمبردار صاحب حق صاحب کے مقابلہ میں زیادہ حوصلہ والے آدمی تھے۔ حیدر کی بات کانٹے ہوئے بہت اطمینان سے بولے۔ ”میرا اعتراض گاندھی جی کی دو ایک باتوں پہ تھا ویسے۔ بیان کی انسانیت کا (نمبردار صاحب نے وسعت قلب کے لفظ کو حذف کر دینا ہی مناسب سمجھا) ثبوت ہے کہ انہوں نے اردو کی حمایت کی ہے۔“

”ہاں صاحب درنہ اس زمانے میں اردو کی حمایت کی کوئی سیاسی مصلحت تو ہو نہیں سکتی تھی۔“

سبطین چارپائی پر بیٹھ تھا۔ اس نے لپٹے ہوئے بستر پر کمر فلک کر پھر سگریٹ کے کش اطمینان سے پیسے شروع کر دیے تھے۔ بحث میں ایک نیا پہلو نکل آیا تھا اور وہ بہت سکون سے سوچ رہا تھا کہ کس پہلو سے دشمن کی جارحانہ کارروائی کا جواب دیا جائے۔ لیکن اتنے میں خشک کا درو زہ کھلا اور اس کے ساتھ ساتھ جنگ کا سارا نقشہ بدل گیا۔ فیاض خاں کو دیکھتے ہی سبطین اٹھ کھڑا ہوا۔

”ارے فیاض خاں تم؟ کوئی گاڑی سے آئے؟ علی گڑھ میں خیریت ہے؟ کھانا کھاؤ گے؟ سامان تانگے سے اتار لیا؟“

سبطین نے تو سوسوں کی ایک پوری قطار باندھ دی تھی۔ لیکن فیاض خاں نے صرف آخری دو سوالوں کا جواب دیا۔ درود بہت مختصر ”کھانا کھاؤں گا۔ سامان آ گیا۔“

فیاض خاں آدمی تھا رعب و اب کا۔ واقعی پٹا ور کا پٹھان تھا۔ لمبا ترنکا۔ سرخ و سفید رنگ۔ جسم بھاری بھر کم نہیں تھا۔ لیکن بدن کی بڑی چوڑی تھی۔

لباس کے نام خاکی کرتا خاکی پانجام۔ بیٹنگ لگی ہوئی۔ سر پر بھورے بھورے خشک بالوں کا ایک چھپر (فیاض خاں کا سر اکثر استرے سے گھٹا ہوا بھی دیکھا گیا تھا) اس درویشانہ حالی نے اس کی شخصیت میں ایک خاص قسم کا وقار پیدا کر دیا تھا۔ آدمی دیکھتے ہی مرعوب ہو جاتا تھا۔ کمرے میں اس کے گھستے ہی حاضرین میں سناٹا چھا گیا۔

پھر جب کھانا آیا تو تھوڑی دیر تک کمرے میں فیاض خاں کے نواسے چبانے کی آواز گونجی رہی۔ باقی سب چپ تھے۔ آخر سبطین نے اس سکوت کو توڑا۔ ”بھئی فیاض خاں۔ اردو کا ذکر چل رہا تھا۔ حق صاحب کو اسرار ہے کہ گاندھی جی نے اردو کی حمایت کر کے وسیع القلمی کا مظاہرہ کیا ہے اور میں یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ وسیع القلمی کا مظاہرہ ہے وسیع القلمی نہیں ہے۔“

فیاض خاں حق صاحب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”آپ کونٹ کا تراشد دیکھنے کا بڑا شوق معلوم ہوتا ہے۔“ اور اس نے ایک چوتھائی روٹی کا ٹواہ بنا شور بے میں ڈبو منہ میں رکھ لیا۔

سبطین فیاض خاں کے نڈاز بیاں کو خوب سمجھتا تھا۔ اس فقرے سے وہ بہت مطمئن ہو۔ لیکن حق صاحب چکر گئے۔ ”کہو مطلب فیاض صاحب؟“

”مطلب یہ ہے کہ نٹ کا تراشد دیکھنے کا شوق ہے تو یہاں کیوں وقت ضائع کرتے ہیں۔ جا کر کسی وسیع القلمی شخص کی زیارت کیجئے۔“

حق صاحب بہت بھنائے۔ ”آپ صاحب کمال کرتے ہیں۔ آپ وسیع القلمی کونٹ کا تراشد بتاتے ہیں۔“

”نٹ کا تراشد نہ کسی مداری کے ہاتھ کی صفائی سہی۔ بہر حال ایک عی بات ہے۔ سب وسیع القلمی لوگوں کا ایک ہی حال ہے۔ وہ سب کچھ ہوتے ہیں وسیع القلمی نہیں ہوتے۔ دنیا کے سارے آزاد خیال اور انسان دوست بازی گر ہیں اور کچھ نہیں۔ شاید یہ آزاد خیالی کا لفظ کسی بازی گر ہی کے ذہن کی اختراع ہے۔“

فیاض خاں جس راستے پر چل پڑا تھا وہ اس کا اپنا راستہ تھا۔ حق صاحب اور نمبردار صاحب کے تو اس کے تصور سے بھی پر ہلے تھے۔ نمبردار صاحب نے بحث کو سمجھ کر موضوع پر مرکوز کرنے کا فرض پھر انجام دیا۔ ”فیاض صاحب نیت کو تئیں دیکھئے یہ دیکھئے کہ اردو کے ہارے میں گاندھی کے اس بیان سے مسلمانوں کو کتنا فائدہ پہنچا ہے؟“

”فائدہ؟“ فیاض خاں رکا۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ نوالہ حلق سے نیچے وتر جائے۔ ”اردو کی حمایت اس وقت مسلمانوں کی سب سے بڑی دشمنی ہے۔“

حق صاحب اور نمبردار صاحب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ سبطین نے گھور کر فیاض خاں کو دیکھا اور بولا۔ ”وہ کیسے؟“

فیاض خاں نے جواب دیا۔ ”کیسے دیسے کچھ نہیں۔ مسلمان دوسروں کے کہے گھوڑے پر نہیں بیٹھتے۔ خود ہار کر گدھے کی سواری کر لیتے ہیں۔ پہلے انہوں نے انگریزی پڑھنے سے انکار کیا تھا اور ہندو سے سو سال پیچھے رہ گئے۔ اب ہندی پڑھنے سے انکار کرتے

ہیں۔ سو سال اب پیچھے رہ جائیں گے۔“

”دو سو سال“ نمبردار کے منہ سے بے ساختہ نکلے۔ ”کچھ نوکریاں پہلے ہندو کے قبضہ میں چلی گئیں۔ کچھ ب چلی جائیں گی۔“

”اور آپ موچی کے موچی یعنی نمبردار کے نمبردار رہ جائیں گے۔“ فیاض خاں نے جس بے ساختگی سے یہ فقرہ کہا تھا اسی بے ساختگی سے گلاس اٹھایا پالی کرکلی کی در چار پائی پر لیٹ کر چار اوڑھتے ہوئے بولا۔ ”اچھا بھئی میں سوتا ہوں۔ مجھے صبح ہی دلی جانا ہے۔“

”دلی؟“ سبطین کے قدموں تلے کی زمین نکل گئی۔

”ہاں دلی۔“

”کیوں؟“

”علی گڑھ پتھن حرفہ۔ مدرسہ اسلامیہ کا پروفانڈا آیا ہے۔ وہاں جاتا ہوں۔“

”مگر آج کل دلی کی لفٹا“

”لفٹ وٹا کچھ نہیں میں جا رہا ہوں۔ اچھا اب مجھے سونے دو۔“ فیاض خاں نے کوٹے کے کچار میں منہ لپیٹ لیا۔

فیاض خاں نے باتوں کا مزہ کر کر کر دیا۔ ہاتوں سے دھیان ہٹا تو لوگوں کو یاد آیا کہ رات ہو چکی ہے۔ لفٹ کشیدہ ہے۔ جدھر گھر پہنچنا چاہیے۔

حق صاحب رستے میں چلتے چلتے کہنے لگے۔ ”نرا حوش ہے صاحب! اٹھنے بیٹھنے بولنے بات کرنے کی مطلق حقیر نہیں ہے۔ دیکھتے

تھے کھانا کیسے کھا رہا تھا جیسے قیدی کھاتے ہیں۔ ایک ایک روٹی کا ایک ایک خوارہ دے۔“

”پشاور کا ڈگنا۔ نمبردار صاحب نے ساری رات کو ایک اصطلاح میں سو کر مختصر کر دیا۔

حمید ڈاکیر نے بھی ٹانگ اڑانی ضروری سمجھی۔ ”کہتا ہے ہندی پڑھو۔“

”یہ سچ کہتا ہے“ نمبردار صاحب نے جواب دیا۔ ”مسلمانوں کے لیے واقعی اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ میں نے تو

بہنی لڑکی کے لیے ہندی کے ماسٹر کا انتظام کر لیا ہے۔“

”آپ نے؟“ حق صاحب چو لگے۔

”صاحب اس میں یہ چوتھنے کی کیا بات ہے؟“ نمبردار صاحب کا بچہ چلے ہو گیا۔

”نمبردار صاحب! میں اس پر نہیں چونک رہا۔ میں تو خود اس کے حق میں ہوں۔ مگر میں نے سنا تھا کہ آپ کی لڑکی آج کل میں پاکستان جانے والی ہے۔“

نمبردار صاحب بات کو ٹالتے ہوئے بولے۔ ”نہیں بھئی راستے غلط ہیں ابھی جانے آنے کا کیا سہرا ہے۔“

آپ کا حود کا کیا ارادہ ہے؟“ حق صاحب تو بے چارے نمبردار کے پیچھے ہی پڑ گئے۔

نمبردار حسرت بھرے لہجے میں بولے۔ ”ارے بھائی ہم کیسے جاسکتے ہیں۔ خزان زمینوں کا کیا کریں؟“

”ہاں صاحب یہی آفت ہے۔“

اس فقرے کے ساتھ ساتھ گفتگو بند ہو گئی۔ البتہ سڑک پر دیر تک قدموں کی چاپ سنائی دیتی رہی۔

لیاض خاں بڑے اطمینان سے پڑا ستارہ ہاتھ۔ لیکن سہلین بہت دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ شروع میں وہ خود سونے پہ ناک نہیں اٹھا تھا۔ وہ بڑے پریشان ور پر گندہ خیالات تھے جو اس کے ذہن میں چکر کاٹ رہے تھے۔ ایک دوسرے تو اس کے بدن میں جھرجھری سی بھی پیدا ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود اس خیالات میں اسے ایسی لذت محسوس ہو رہی تھی کہ اس نے نیند کی سر سے پردا ہی نہیں کی۔ لیکن جب اس کے دماغ نے کوئی نئی بات سوچنے سے انکار کر دیا اور وہی پرانی تصویریں بار بار نظروں کے سامنے آئے لگیں تو پھر اسے سونے کا خیال آیا۔ لیکن نیند نہ جانے کدھر تک گئی۔ اب ذہن بھی خالی تھا اور آنکھیں بھی۔ اس نے پاری یکسوئی کے ساتھ آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی۔ لیکن ذہن کے کسی کوئے کھڈے سے کوئی ہڈی بھی اٹھوری تصویر ابھرتی اور بار بار اس یکسوئی میں خلل ڈال رہی۔ ایک مرتبہ اسے جھپکی آئی بھی تھی۔ لیکن بغیر کسی وجہ کے وہ چونک پڑا۔ اور آنکھ کھل گئی۔ دوسری مرتبہ جب اس پہ غنودگی طاری ہوئی تو وہ واردات گزری کہ جو کوئی بھی ہوتا اس کی آنکھ کھل جاتی سامنے کے مکان کی چھت سے گانے کی آواز آنے لگی۔ یہ آواز اگرچہ بہت دھیمی تھی۔ لیکن اول تو یہ نسوانی آواز تھی۔ پھر اس میں ایک درد کی بھی کیفیت تھی۔ اس لیے مگر سہلین کے کان اس طرف لگ گئے تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہوئی۔ نیند کی پریاں جو دبے پاؤں آرہی تھیں۔ وہ ایکایک پھر غائب ہو گئیں۔ اس کا سامعہ پورے طور پر بیدار ہو گیا۔ گانے کی آواز دھیمی ہوتی گئی دھیمی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ سنگناہٹ میں تبدیل ہو گئی اور پھر معدوم ہو گئی۔ لیکن سہلین کو یوں محسوس ہوا کہ جہاں سے یہ پرسوز راگ ابھرا تھا وہاں بدستور کوئی چیز دھڑکے جا رہی ہے۔ اس کا دل بھی دھڑکنے لگا لیکن بڑی نرم روی کے ساتھ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بس کبھی کبھی اس پہرے داروں کی آواز آ جاتی تھی جو گلوں میں نئے نئے مقرر ہوئے تھے۔ ہوا خاموش تھی۔ البتہ ستاروں سے لدا چنندا آسمان کچھ متحرک سا معلوم ہو رہا تھا۔ یہ ستارے

کچھ جب بے ترتیبی سے بکھرے پڑے تھے۔ ایک خاصے رقبے میں چار کی سی تار کی تھی۔ اس میں اکا دکا ستارے جھلک جھلک کر رہے تھے۔ لیکن بعض مقامات پر ستاروں کا جھرمٹ کچھ اس طرح بن گیا تھا جیسے پلچھڑی جھوٹ رہی ہو۔ کئی ایک جگہ یوں معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے چمکتے ذروں سے بھری پچکار دی چھوڑی جا رہی ہو۔ ایک سمت میں ننھے ننھے ستارے آہیں میں کچھ اس طرح مغم ہو گئے تھے کہ ن کا لگ لگ وجود بالکل ختم ہو گیا تھا۔ بس یوں لگتا تھا کہ بہت سے ستارے تار دکھا کر پھسل گئے ہیں اور آسمان کے دامن پر روشنی کا ایک بڑا سادھ پڑ گیا ہے۔ ان ستاروں کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا کہ دف کا دل تیزی سے دھڑک رہا ہے اور آسمان کے جسم میں ایک تھر تھری سی پید ہو گئی ہے۔ سبطین نے یوں محسوس کیا کہ فنگل کے نرم نرم گالے پھسل کر اس کی آنکھوں میں گھل مل رہے ہیں۔ لیکن چپت پڑے پڑے اسے اب چمکے بے آرمائی محسوس ہوئے لگی تھی اس نے ہائیں ہاتھ کر دی۔

فیاض خاں شاید اس کے کروٹ پٹنے کا فکدہ رہی کر رہا تھا۔ نہ معلوم اس کی آنکھ کس وقت کھل گئی تھی۔ پورا۔ "سبطین جاگ رہے ہو؟ کیوں نیند نہیں آتی؟"

"ہاں کچھ نیند اچٹ سی گئی ہے۔"

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"سوچتا ہوں کہ تم دلی جا رہے ہو۔"

"تو پھر؟"

"پھر کچھ بھی نہیں۔"

فیاض خاں نے کچھ جو ب نہ دیا۔ دلوں چپ چاپ لیٹے آسمان کو دیکھتے رہے۔ فضا کا دل اپنی مخصوص رفت کے ساتھ دھڑکے جا رہا تھا۔ مشرق کی سمت میں ایک ستارہ ٹوٹا اور ایک سفید دھاری یوں پڑتی چلی گئی۔ جیسے کسی کے گلے میں خراش پڑ جاتی ہے۔

آخر سبطین پھر پورا۔ "فیاض خاں اسو گئے؟"

"نہیں۔"

"تم دلی کیوں جا رہے ہو؟"

"جھک مارنے۔"

"اور علی گڑھ میں کیا کرتے رہے تھے؟" سبطین کو بھی آخر تا ڈاڑھی کیا۔

”جنگ مارتا تھا۔“

”پھر یہ دلی کا شوق کیوں چرایا ہے؟“

”علی گڑھ کے نوجوانوں سے جنگ ماری دس کا کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ اب سوچتا ہوں کہ دوسرا اسلامیہ کے نونہالوں سے بھی جنگ مار سکے دیکھ لوں۔“

”میرا مشورہ یہ ہے کہ تم دلی نہ جاؤ۔ پاکستان چلے جاؤ۔ وہاں تحریک کے پنپنے کا بڑا امکان ہے۔“

”تم خطا سمجھتے ہو؟“

”ٹھیک سمجھا ہوں۔“

”سنو۔ علی گڑھ سے بہت سے تالے والے اور کچھ پنشن یافتہ ڈپٹی کلکٹر اور چالاک قنیدار پاکستان گئے ہیں۔ چلتے وقت ان میں سے ہر شخص نے یہی اعلان کیا تھا کہ ہم پاکستان کی تعمیر کرنے جا رہے ہیں۔ پاکستان ان کا استقبال کرے گا۔ ہمارا تمہارا استقبال نہیں کرے گا۔ پاکستان کو اتناڑی قفل ساروں پنشن یافتہ ڈپٹی کلکٹروں اور چالاک قنیداروں کی ضرورت ہے۔ ہماری تمہاری ضرورت نہیں ہے۔“

”میں نہیں مانتا۔“

”مت مانو۔“

”تم دلی جا کر وقت ضائع کر رہے ہو۔“

”وقت تو ضائع ہو چکا۔ وقت اب ہے کہاں جو ضائع کروں۔“ تنگلو کے دوران میں یہ پہلا موقع تھا کہ فیاض خاں کے لہجہ میں رقت کی کیفیت پیدا ہوئی۔

سبطین نے پھر ریکی اور بولا ”وقت ضائع نہیں ہوا ہے۔ وقت نے کروٹ لی ہے۔“

فیاض خاں نے بڑے طنز سے پوچھا۔ ”کیا پاکستان جانے کا منصوبہ ہے؟“

”نہیں۔ ہرگز نہیں۔“ سبطین نے بڑے طنز سے جواب دیا۔

”پھر مجھے کیوں ہدایت کی جا رہی ہے؟“

”میں جاؤں گا تو یہ فرار ہوگا۔ تم جاؤ گے تو یہ وطن کو واپسی ہوگی۔“

فیاض خاں نے ایک زور قہقہہ لگایا۔

پھر خاموشی چھ گئی۔ لفظ بدستور جاگ رہی تھی۔ سکوت کا بے پایاں راگ درد و سوز کی مخصوص کیفیت کے ساتھ نرم روی سے کروٹیں لیے جا رہا تھا۔

”سبٹین“ اس مرحلہ فیاض خاں کی طرف سے پہل ہوئی۔

”ہوں۔“

”یہ سامنے والے مکاں میں کون آ کر رہا ہے؟“

سبٹین چونک پڑا۔ ”کوئی نہیں۔ عجیب سے لوگ ہیں۔ مرد راتوں کو جانے کہاں منرگشتیوں کرتا ہے۔ عورت آہیں بھرتی ہے یا کلیں کرتی ہے۔“

”تمہارا اس سے کوئی تعلق ہے؟“

اس دو ٹوک فقرے پر سبٹین بڑا گیا۔ ”نہیں... نہیں۔ کیوں۔“

”نہیں ہے تو پیدا کر لو۔“ فیاض خاں نے اپنے معروضی انداز میں اب تک کوئی فرق نہیں آنے دیا تھا۔

سبٹین نے پوچھا۔ ”کیوں؟“

”میرا وجود نہ کہتا ہے۔ کہ تم کسی نہ کسی روز ضرور محبت کرو گے۔“

سبٹین ہنسا کر بولا۔ ”اچھا وجود ان ہے تمہارا۔“

”میرا وجود نہ بھی غلط نہیں کہتا۔“ فیاض خاں نے بڑے مطمئنانہ سے کہنا شروع کیا۔

”در اصل تم میں سوائے عورت سے محبت کرنے کے اور کوئی صلاحیت نہیں ہے۔ تم اب تک اپنے آپ کو نہیں پہچانے۔ تم ہمیشہ وقت کے بعد جاگتے ہو۔ ایک روز تمہیں پکا ایک اپنی اصل صلاحیت کا پتہ چلے گا اور تم کسی لڑکی سے محبت کرنا شروع کر دو گے۔ مگر اس وقت وہ تمہیں منہ نہیں لگائے گی۔ ابھی موقع ہے۔ وقت ضائع نہیں ہوا ہے۔“

”اچھا چپ رہو۔“ سبٹین کا قصہ سے برا حال ہو گیا تھا۔

فیاض خاں چپ ہو گیا۔ چند منٹ تک پھر خاموشی طاری رہی۔

”اچھا سبٹین یہ بتاؤ کہ اس شخص کی عمر کیا ہوگی؟“ فیاض خاں کرید کرید کر پوچھے جا رہا تھا۔

”ادھیز عمر کا آدمی ہے۔“

”بیوی جوان ہے؟“

”بالکل جوان“ سبطین کو غصہ بھی آ رہا تھا اور جواب بھی بڑے شوق سے دے رہا تھا۔

”لاڑکی ہے یا عورت؟“

”میں اس کا نکاح پڑھانے نہیں گیا تھا۔ جو مجھے اس کی عمر معلوم ہوتی۔“ سبطین کو پھر تاد آ گیا۔

”قیاض خاں نے بہت سکون سے جواب دیا۔ ”بچوں کی سی باتیں نہ کیا کرو۔ لاڑکی اور عورت میں فرق عمر کا نہیں ذہنیت کا ہوتا

ہے۔“

”تو پھر یہ عورت ہے۔“

”عورت ہے؟“ قیاض خاں چونکا۔ ”معاد ٹیڑھا ہے۔ اب تم ہاتھ مت ڈالنا۔“

”کیا مطلب؟“

”بات یہ ہے کہ لاڑکی کا معاد تو بہت سیدھا سادہ ہوتا ہے۔ چہ پری چہ پری کا شور ہے۔ مرنجھلے سے مرنجھلے مرد بھی غریب کو دبوچ لیتا

ہے۔ لیکن عورت خوفناک چیز ہوتی ہے۔ وہ خود مرد کو دبوچ لیتی ہے۔ ایسے جیالے تو کم ہی دیکھے ہیں جو عورت پر غالب آ جاتے ہیں۔“

”اپنے متعلق کیا خیال ہے تمہارا؟“ سبطین نے جمل کر پوچھا۔

”اپنے متعلق؟“ قیاض خاں سوچتے ہوئے بولا۔ ”کبھی کبھی مجھ میں بڑی شدت سے یہ امنگ پیدا ہوتی ہے کہ یہ دھندا اچھوڑ دو اور

کسی عورت سے نکل دو۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ میں عورت پہ غالب آ جاؤں گا اس لیے میں اسے روکنا ہی کر دیتا ہوں۔“

سبطین نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ ہونے کے سوا اس کے لیے اور چارہ بھی کیا تھا۔ اس نے میں دور سے گھٹنے کی آواز کی۔ ایک

نچ رہا تھا۔ سبطین نے ”کھینیں بند کر لیں۔“ اچھا اب سوھاؤ۔ آدمی رات گزر گئی۔“

قیاض خاں چادر میں منہ لپیٹے ہوئے بولا۔ ”آدمی رات ابھی اور باقی ہے۔“

سناں بیابان فضا میں زرد رو چاند اکیلا رنگ رہا تھا۔ خوف و ہراس کی ایک مبہم پراسرار کیفیت چاندنی کی نس نس میں رہی ہوئی

تھی۔ بلند و بالا رتیں درخت نیلے یہ سب یوں چپ چاپ کھڑے تھے گویا کسی نامعلوم خوف کے اثر سے سکڑے ہوئے تھے۔ ایک

مسجد کے سفید مینار آسمان کی طرف کچھ یوں اٹھے ہوئے تھے گویا تھکے ماعے چاند کو سہا ہوا دیکھ کر بے قراری میں کسی کی بائیں اٹھ گئی

ہیں اور اگلے گنبدوں کو دیکھ کر کچھ ایسا لگاں گزرتا تھا کہ ایک محبت بھرا سینہ کسی کو اپنے اندر چھپا لینے کے لیے بے تابی سے دھڑک رہا ہے۔ رستے ویران پڑے تھے۔ گلیاں اور سڑکیں ہوا میں گر رہی تھیں۔ پھینکی پھینکی چاندنی۔ سبھی ہوئی فضا۔ چپ چاپ بلند و بال مکان۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس ہستی کے سارے لوگ کہیں باہر چلے گئے ہیں اور یہ مکان ڈھنڈا پڑے ہیں اور پھر یوں محسوس ہوتا کہ ان میں پر اسرار روحیں چل پھر رہی ہیں پھر اچانک کسی بہت دور کی گلی سے ایک قد آور سایہ نکلتا نظر آتا۔ وہ ایک ڈگ میں ایک گلی اور دوسرے ڈگ میں دوسری گلی پار کرتا اور بڑھتا چلا آتا۔ اونچی اونچی چھتوں اور مسجد کے گنبدوں پر اس کی ڈرونی پر چھائیں کا ہنسی نظر آتی اور پھر بائیں قد درختوں اور سیدوں میں سرکتی دکھائی دیتی۔ سایہ ڈگ بھرتا ہوا دور نکل جاتا اور نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا اور گلیوں پھر بھی نہیں بھاہیں کرنے لگتیں۔ یوں لگتا کہ فضا کی کھٹکھی بندھ گئی ہے۔ ایسا کی کسی نامعلوم سمت سے ایک عقاب آہستہ آہستہ اڑتا ہوا آیا۔ ایک منٹوں پر چھائیں پھر اونچی اونچی چھتوں اور مسجد کے گنبدوں پر کانپتی دکھائی دی۔ عقاب اڑتا اڑتا کسی نامعلوم سمت میں کھو گیا۔ پھر سناٹا چھ گیا۔ چاند کا رنگ کچھ اور پیکا پڑ گیا۔ جیسے کسی لقی ووق صحرائیں کوئی مسافر قافلہ والوں سے چھٹ کر راست بھول جائے اور شروع شروع میں خوب دوڑے۔ اتنا دوڑے کہ ہانچے لگے اور پھر تھک کر ریٹنا شروع کر دے۔ کچھ اسی قسم کی کیفیت چاند پر گز رہی تھی۔ فضا کے ویران اجڑ بن میں وہ اکیلے بھٹکتا پھر رہا تھا۔ اتنے میں کسی دور کی گلی سے کسی کے لوح کرنے کی پر اسرار آوازیں آئیں۔ یہ پر اسرار دھیمی آوازیں چند لمحوں کے لیے تیز ہو گئیں۔ مگر پھر مدھم پڑ گئیں۔ چاند کی شکل بدلنے لگی اس کا ایک کنارہ سرخ پڑ گیا۔ جو مکان سفین ویران پڑے تھے وہ ایسا کی ایک خوفناک قسم کے شور سے گونج اٹھے۔ عورتیں بچے و مرد چھتوں پر چڑھ گئے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ پھر تنگ دھڑنگ فقیروں کا ایک گروہ سر پٹ آتا دکھائی دیا۔ پیسے کھینچے یہ تو جسم ڈر آنے چہرے لال مال آنکھیں گردنوں کی رکیں پھوٹی ہوئی سانس چڑھے ہوئے۔ انہوں نے گلوں میں جھوپیاں ڈال رکھی تھیں۔ وہ دوڑتے ہوئے چل رہے تھے اور بے طرح شور مچا رہے تھے۔ سیاہ کتوں کا ایک پورا جھومر بھونکتا ہو ان کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ ہر دروازے پر پہنچی کر دو گودیاں پھیلا دیے اور گود یوں میں اناج آ پڑتا۔ وہ پھر دوڑتے ہوئے آگے بڑھتے اور سیاہ کتے جوائیں رکتا ہوا دیکھ کر چپ ہو جاتے تھے پھر بھونکتے ہوئے دور نے لگتے چاند پر ایک کرب کی کیفیت طاری تھی۔ سرخی پھیلتی گئی گہری ہوتی گئی۔ سرخی اور پھیلی اور گہری ہوئی۔ آدھا چاند سرخ ہو گیا آگ کے انکارے کی طرح دہکنے لگا۔ کھوار کے گھاؤ کی طرح خونا خون ہو گیا۔ پھر ایک سمت سے غبار اٹھا۔ زرد زرد غبار بلند ہوتا گیا پھیلتا گیا۔ آندھی کے جھکڑ چلنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے فضا میں مکروہ صورت عورتوں کا جلوس نمودار ہوا خون سے لت پت بے سر کے جسموں پر وہ سوداہ تھیں۔ ان کے لیے بے خشک بالوں سے

آگ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں اور بل کھاتا ہوا سیاہ دھواں ان کے منہ سے نکل رہا تھا۔ ان کی رہائیں نکل ہوئی تھیں۔ اس سے خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں اور اس جلوس کے ساتھ ساتھ گرج کی آواز سنائی دی۔ زمین ہلنے لگی۔ ہمارے اڑاڑاؤم کر کے کرے لگیں۔ لوگ گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ مسجد کے مینار سرنگوں ہو گئے اور فضا میں ایک گرجدار آواز گونجی "گر پڑا۔ بڑا شہر گر پڑا۔" کسی نامعلوم سمت سے کسی کے نوحہ کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ "اے بڑے شہر۔ اے بستیوں کی ملکہ افسوس۔ افسوس۔ افسوس" ایک ہلکی سی جھنجھ کے ساتھ بوجی کی آنکھ کھل گئی۔ ان کا جسم تھر تھرا کانپ رہا تھا۔ اور دل بس یوں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز بار بار بڑی تیزی سے سینے کی پسپیوں سے آ کر ٹکراتی ہے اور بار بار ایسا ملتا کہ اب پسلیں چٹھیں اور اب کلیجہ اچھل کر باہر نکلا۔ بوجی کو بہت دیر تک تو یہ حساس ہی نہ ہوا کہ وہ واقعی جاگ پڑی ہیں۔ وہ پوری فضا ہی شدت کے ساتھ ان کے تصور پر بدستور سوار رہی۔ بہت اس کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا تھا۔ کبھی کوئی تصویر نظر کے سامنے آ جاتی۔ کبھی اس نوحہ کی آواز سنائی دینے لگتی۔ اے بڑے شہر۔ اے بستیوں کی ملکہ۔ افسوس۔ افسوس۔ افسوس۔ لیکن وقت بڑا ظالم ہے۔ کیسی ہی شدید کیفیت ہو وقت کے ساتھ خود بخود دھیمی پڑنے لگتی ہے۔ آخر بوجی کی طبیعت ذرا ٹھکانے آئی۔ جوہ واقعی جاگ اٹھی تھیں۔ انہیں اب ہوش آیا کہ دراصل یہ سب کچھ واقعی ہوا نہیں ہے، محض اک خواب تھا۔ انہوں نے بڑے ظلم سے اپنے آپ کو یقین دہانے کی کوشش کی کہ یہ محض ایک ڈراؤنا خواب تھا، ایک دوسرا تھا، شیطان نے انہیں ڈرایا تھا۔ اس کی وجہ بھی ان کی سمجھ میں دراصل بہت جلد آ گئی۔ ہوا یوں کے سودا اتفاق سے ان کی جوتیاں سرہانے پڑی رہ گئی تھیں۔ جب جوتیاں سرہانے پڑی ہوں تو پھر گر ڈراؤنے خواب نہ دیکھیں تو واقعی تعجب کی بات ہے۔ لیکن اس معقول توجیہ کے باوجود بوجی کا دوسروں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ انہیں بار بار اپنی اماں جی کی یہ روایت یاد آتی تھی کہ ۵۷ء سے پہلے ایسا چانگن پڑا تھا کہ پورا چاند گھٹنا گیا تھا۔ اور اس روایت کے خیال کے ساتھ ساتھ ان کے جسم میں ایک کچکی سی دوڑ جاتی تھی۔

بوجی نے صبح کی اذان کا مطلق غلط نہیں کیا۔ انہیں وقت کی یوں بھی بہت انکل تھی اور پھر ستاروں کی نقل و حرکت نے بھی ان کی تھوڑی بہت مدد ضرور کی تھی۔ انہوں نے منہ ہاتھ دھو یا وضو کیا اور جاننا ز پر کھڑی ہو گئیں۔ لہذا تو انہوں نے جلدی ہی ختم کر لی۔ لیکن تسبیح کا ورد صبح تک جاری رہا۔ جب ڈرا جالا ہوا تو انہوں نے کلام مجید کا جزاں کھول کر اپنی عینک نکالی۔ پھر تسمیہ دینی کھولی۔ اس میں سے تعبیر نامہ نکلا۔ گ۔ کی تختی میں کئی مقامات پر اس کی نظر اُگی۔ گا جرد دیکھتا۔ گائے دیکھتا۔ گہن دیکھتا۔ ان کی نگاہیں ٹھٹھکیں اور پھر آگے بڑھ گئیں۔ گہن چاند کا دیکھتا۔ انہوں نے غور سے اس کی تعبیر پڑھی لکھی تھی۔ "کال پڑے یا بادشاہ پتافت آئے۔ رعایا پریشان ہو۔ جان و مال کا نقصان ہو۔ چاہیے کہ خواب کسی سے نہ کہے۔ رفع بلیات کی خاطر صدقہ دے۔"

گلشن اٹھ بیٹھی تھی۔ ہار پی خانے میں وہ کچھ ستر پڑ کر رہی تھی۔ یوں تو وہ بہت دیر سے بڑا بڑ رہی تھی۔ مگر ایک مرتبہ اس نے شاید بوجی کو سنانے کی غرض سے اونچی آواز سے کہا۔ ”کنکشن کا کتنے ٹکڑے قبر میں دس کی کیڑے پڑیں۔ نہ پانی سا دودھ دے جاوے ہے کل آئے جیسی بچہ دس کے منہ پر ماروں گی۔“ گلشن کے فقرے خاصے گراں گیز تھے۔ لیکن بوجی کو مطلق تحریک نہیں ہوئی۔ سن کی عادت اس وقت بھی غیر تھی۔ ہاتھ دیر کا نہ رہے تھے۔ چہرہ چلا پھدق پڑا تھا۔ گلشن کے فقروں کو انہوں نے سرے سے ہی نظر انداز کر دیا۔ انہوں نے خاموشی سے جانم زبانی اور ہنسی کا ہنسی اندر چلی گئیں۔ صندوق کھوں کر انہوں نے اپنا کپڑے کا بنو ٹکا۔ اور پھر گلشن کو کاٹتی ہوئی آواز میں بلایا۔ ”گلشن ارئی، گلشن۔ ارئی یاں آئیو۔“

گلشن دودھ کے متعلق اظہار خیال سے تو بے فکر اس وقت تک فارغ ہو چکی تھی۔ لیکن چائے کے لپے میں ہمارو ڈی ہوئی دیکھ کر اس کا پارہ پھر چڑھ گیا تھا اور اس وقت وہ رفا کو غاٹا ہانہ لعنت ملاست کر رہی تھی۔ بوجی کا یہ بے وقت ہلدار سے بالکل پسند نہ آیا۔ بلکہ اس نے صاف صاف کہہ بھی دیا کہ ”اجی میری دونائیں ہیں۔ چار ناٹیں گاں سے لی آؤں۔ چابناؤں یا تمہاری سنوں۔“ مگر اس فقرے سے تعمیل حکم میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ یہ تو محض ایک واقعہ کا اظہار تھا یا زیادہ سے زیادہ حرف شکایت یا صدمے کی محتاج۔ گلشن جب کمرے میں پہنچی تو بوجی بٹوے سے پانچ روپے کا نوٹ نکال چکی تھیں۔ اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولیں ”بی بی رفا کو جا کے یہ پانچ روپے دے کہ بزار سے گیموں خرید کے محتاجوں میں بانٹ دے اور لے اٹھنی اور دوں ہوں۔ ن کے بیڑے کے کٹر شاہ کے مگر پہ چڑھایا۔“

گلشن کا سا راضہ رنو چکر ہو گیا۔ اب وہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔ غصے کا بھی وقت اور موقع ہوا کرتا ہے۔ گلشن نے کبھی بے وقت غصے کا اظہار نہیں کیا۔ اس بے وقت خیرات پہ وہ حیران تو بہت ہوئی لیکن چونکہ بوجی اس راز پر سے پردہ اٹھانے سے گریز کر رہی تھیں۔ اس لیے اس نے بھی انہیں چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ جب بھی کوئی سنگین مسئلہ درپیش ہوتا۔ تو بوجی ہزار احتیاطات کے باوجود خود گلشن سے رجوع کرتی تھیں۔ لیکن جب وہ پراسرار طور پر چپ ساتھ لیتیں تو پھر گلشن اپنے وجدان کے زور پر مسئلہ کی تہ تک پہنچتی تھی۔ اس وقت بھی اگرچہ اسے وعدہ کا علم نہ تھا مگر واقعہ کی نوعیت کو وہ ضرور بھانپ گئی تھی۔ اس نے فی الحال چپ رہنے کا ہی ارادہ کیا تھا۔ اس سنجیدہ محفل میں جس نے جوتی اچھالی وہ سبھین تھا بوجی کو یہ خبر ہی نہ ہوئی تھی کہ سبھین کس وقت اٹھا ور کس وقت کمرے میں آ بیٹھا۔ شاید یہ سب کچھ ان کی نمار کے دوران میں ہوا تھا۔ سبھین اس وقت کسی کتاب پر جھکا ہوا تھا۔ بوجی کی نقل و حرکت اور گفتگو پہ وہ چونکا۔

”بوجی صبح ای صبح یہ کیا ہو رہا ہے؟“

بوجی بہت شینا گئیں۔ ”رے پیٹا وہ پہلی تاریخ کو نیاز کا نکالنا بھوں گئی تھی۔ آج مجھے خیال آیا۔“

”بھول گئی تھیں تو بس بھول جاؤ۔ یہ تمہیں بھولی ہوئی باتیں رو رو کے کیوں یاد آ کر رہی ہیں۔“

بوجی کو بیٹے کا یہ نماز گفتگو پسند نہ آیا۔ پھر بھی انہوں نے بڑے ضبط سے کام لیا۔ ”ارے بھئی مجھے شک آدے ہے۔ اللہ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔“

”اچھا شک ہے تمہارا۔ اور حفظ و امان میں تو ہیں۔ آخر کوئی قیامت نوٹ رہی ہے۔“ سبطین تو بوجی کے پیچھے ہی پڑ گیا۔

مگر بوجی نے پھر بھی نرمی ہی سے جواب دیا۔ ”ارے بیٹا ایسی بد شگونی کی آوار نہیں نکالا کرتے۔ اور بھئی پیسے کا کہو ہے۔ پہنے ہاتھوں کا سیل ہے۔ پیروں فقیروں کے نام نکالتے ہوئے کڑا نہیں کرتے ہیں۔“

سبطین درگرم ہوا۔ ”اجی ن پیروں فقیروں کے ٹبر کو کب تک برداشت کرو گی۔ چھٹی کرواناں کی۔“

بوجی اس مرتبہ تو عمدہ ہی اٹھیں۔ جھلا کر بولیں۔ ”ارے لڑکے ہوش کے دوا لے۔ زبان میں ڈارنگام نہیں ہے۔ سوچے نہ کہے جو منہ میں آئی کہہ دیا۔ اور یکا یک وہ دوسرے رستے پہ چل پڑیں۔“ ارے بھی میرے تو ہولیں اٹھے ہیں۔ آجکل کے دن ویسے ہی خراب ہیں۔ اللہ بنا رحم کرے۔ مجھے طرح طرح کے خیال آدے ہیں۔ مجھے تو راتوں کو نیند نہیں آتی۔“ بوجی کچھ کہتے کہتے یکا یک چپ ہو گئیں۔

گلشن اب تک خاموش تھی۔ مگر اب اس کے بولنے کا موقع آ گیا تھا۔ اس موقع کو اس نے گنوا نا مناسب نہ سمجھا۔ ”اجی بوجی نیند دن سے میری سیدھی آنکھ پھڑک رہی ہے۔ اللہ خیر کرے۔“

بوجی نے فوراً اس کی رہبان بندی کر دی۔ ”ارے بھئی ایسی آواز منہ سے مت نکالو۔ مجھ رانڈ کا دل ویسے ہی دائی تو آئی ہے۔ مجھے تو اس گھر کو دیکھ دیکھ کے حشاکان ہو دے ہے جنہیں کیا بات ہے“ بوجی بولتے بولتے پھر رکیں اور کچھ سوچ کر یکا یک بولیں۔ ”ری گلشن تو ذرا چاسے فارغ ہو کے مولوی صاحب کے پاس تو جاؤ۔ کہنا کہ ہمارے گھر کو کیل دو۔“

اس آخری فقرے پر سبطین بہت گرمایا۔ ”اجی بوجی یہ کیلنا دینا تم نے کیا لگایا ہے۔“

مگر بوجی نے اس مرتبہ اسے اچھی طرح ڈانٹ دیا۔ ”ارے چل رے لڑکے۔ ہمارے آگے کا اونڈا ہمیں نصیحت کرے ہے۔“

جبکہ کیا ضرورت ہے ان باتوں میں ٹانگ اڑانے کی۔ جا اپنے انہیں سڑوں مسٹرڈوں میں جا۔ ان سے مغرمار کر۔“

سبطین کی ساری گری بھاپ کی طرح اڑ گئی۔ موقع غنیمت جان کر گلشن نے بھی اپنی بزرگی جتانے کے لیے ایک فقرہ کہہ ڈالا۔

”ہاں جی سپو میاں تم کیا جانو باتوں کو۔ اللہ رکھو تم جوان ہو پر یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ تم بوجی کو نصیحتیں کرو۔ ون کے کے یہ تو تم کل کے موٹرے ہی رہو گے۔“

اور بوجی نے چپے چپے گلشن کو ایک اور ہدایت کی۔ ”اور دیکھ رو گلشن۔ نمبر دارنی کے گھر اور وکیل صاحب کے اور کوٹھے والی کے کہہ دیجو کہ جمعرات کو وہاں رہے گھر مجلس ہے۔“

حق صاحب نے نہ معلوم کیا سوچ کر پھر قوم کی رہنمائی کرنے کی ذمہ دار سبجال کی تھی مگر ایک نے نہ زسے۔ یہ سب سے تو وہ کئی مہینے پہلے کنارہ کش ہو کر گیس دھیان میں مصروف ہو گئے تھے۔ جون ۷۲ء کا پورا مہینہ تو انہوں نے سوچ بچار میں گزارا تھا۔ مہینے بھر تک ان پر تذبذب کی ایک کیفیت طاری رہی۔ مگر مہینے کے ختم ہوتے ہوتے انہوں نے قطعی فیصلہ کر لی یا اور شہری مسلم لیگ کی صدر رت سے مستعفی ہو گئے۔ یہ اسی زمانے کی بات ہے کہ انہیں یکا یک گاندھی جی کی انسان دوستی کا احساس ہوا تھا۔ ہندو جواہر لال نہرو کی آزاد خیالی کا بھی پتہ انہیں اسی زمانے میں چلا تھا۔ جہاں تک مولانا ابوالکلام آزاد کا تعلق ہے تو خود ان کی روایت یہ ہے کہ وہ بہت پہلے سے ان کے علم و فضل کے قائل تھے انہوں نے لالہ رگھو بر دیال ہزار کی دوکان پر بیٹھ بیٹھ کر برطانوی خیریت کا اظہار کیا۔ انہیں یہ بات کھائے جاتی تھی کہ انہوں نے اپنی ساری عمر ایک فرقہ پرست جماعت کی خدمت میں گنوا دی۔ ساتھ ہی انہیں اس کا احساس تو ضرور تھا کہ کسی قسم کی بھی کمیٹی بنے کا مگر کسی مسلمانوں ہی کی اس میں بوجھ ہوتی ہے اور راہبگ کے دفاتروں میں تو وہ دراندہ گھسے چسے جاتے ہیں اور پانچ پانچ سیر بھگتی اور بیس بیس گز کپڑے کے پرست چٹکیوں میں بٹواتے ہیں لیکن اس احساس کی حیثیت تو ثانوی تھی۔ زیادہ تر تو انہیں ان کا ضمیر ان کی فرقہ پرستانہ سرگرمیوں پر ملامت کر رہا تھا۔ کوئی بھد مانس ہوتا تو ان کی قلب ہدایت کی قدر کرتا۔ ورنہ انہیں مہینے سے لگا لیتا۔ لیکن لالہ رگھو بر دیال تو بس سے مس نہ ہوئے اور نہ ان کی دوکان پہ بیٹھے۔ لے دھرے لوگوں نے ان کی باتوں پر توجہ دی۔ چنانچہ جب بقر عید آئی اور مسلمانوں میں شکر اور کپڑا تقسیم کرنے کے لیے کمیٹی بنائی گئی تو اس میں حق صاحب کو صاف نظر انداز کر دیا گیا۔ امن کمیشین بھی محلہ محلہ بنیں مگر حق صاحب غریب کہیں نہ تھے اس کا اثر یہ ہوا کہ انہوں نے مایوس ہو کر دنیا کے جھگڑوں سے ہی قطع تعلق کر لیا اور گوشہ نشین بن گئے۔ لیکن جب قریب و دور سے فسادات کی خبریں آنی شروع ہوئیں اور شہر کی فشار روز بروز کشیدہ ہوتی گئی تو اس سے ان کے ایرا پھیری کے میاں کو شہرٹی۔ سبطین نے تو جلسہ میں کئی مرتبہ ان کی ٹانگ کی تھی۔ لیکن وہ کافی سخت جاں نکلے اور غرضہ کے مسلمانوں کے منتقم کرنے اور مذہب دارس بندھانے کا فرض انہیں سوچ ہی دیا گیا۔

حق صاحب نے پنا فرض بڑی تندہی سے انجام دیا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر یہ کیفیت ہوئی کہ محلہ کی دیواروں میں ایک نئی روح

درونی نظر آنے لگی۔ "اسلام عمل کا نام ہے۔" "مسلم تو عمل کرنا" نماز سب سے بڑا عمل ہے۔ "دروغ محشر کہ جاں گدہ ربود۔ او میں پرسش نماز ربود۔" اور ان فقروں نے دو زور باندھا کہ دیواروں پر جتنے تھے پرانے اشتہاری اور غیر اشتہاری فقرے لکھے ہوئے تھے وہ سب ماند پڑ گئے۔ حق صاحب نے محض اس پروپیگنڈا مہم پر قناعت نہیں کی۔ بلکہ چند عملی اقدامات بھی کئے فیصلہ کیا گیا کہ جو شخص مغرب و مشا کی نماز پر مسجد میں نہ پہنچے اس پر چوٹی جرمانہ کیا جائے۔ جن ان پڑھ مسلمانوں کو کلمہ یاد نہیں تھا انہیں کلمہ یاد کرانے کی بھی مہم شروع کی گئی۔ اس کام میں اگرچہ نمودار صاحب اور حمید ذاکیر نے ان کا بہت ہاتھ بٹایا لیکن خود انہوں نے بھی چار پانچ آدمیوں کو کلمہ سکھایا تھا۔ عدم تعاون کی شکایت دراصل انہیں سبطین سے تھی۔ سبطین نے ان کی ہر تجویز پر فقرہ بازی کی اور ہر اقدام کا مذاق اڑایا۔ رفیہ کو اگر حق صاحب کلمہ نہ سکھائے تو اس میں صرف رفیہ کی جہالت کا ہی نہیں سبطین کا بھی قصور تھا۔ رفیہ "را" تو بڑی آسانی سے کہہ بیٹا تھا۔ ہاں "ال" کے لفظ پر اس کی زبان ٹکھڑا نے لگتی تھی۔ "لا اللہ" کی منزل تک پہنچنے کا کبھی سبطین نے ہی موقع نہیں دیا۔ وہ تو بے ساختہ فحش پڑتا تھا۔ اور رفیہ کے آئے تو اس گم ہو جاتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ حمید ذاکیر کی کوششیں سب سے زیادہ بار آور ثابت ہوئیں۔ اس نے اسٹیشن پر پہنچنا شروع کر دیا۔ اسٹیشن پر جو گاڑی آ کر کھڑی ہوتی وہ مسلمانوں کے کسی ڈبے میں پہنچتا دروگوں کو خوف خدا سے ڈراتا اور کلمہ سکھانے کی تلقین کرتا۔ اندھا دھند چلتی ہوئی گاڑیوں کے مسافروں بھی رشد و ہدایت کی روشنی فہم کرنے پر اپنی طور پر تیار ہوتے ہیں اور اس زمانے میں تو غیر ہر مسلمان سفر کو زندگی کی سب سے بڑی آزمائش سمجھتا تھا اور خوف خدا سے خود بخود داڑی لگتا تھا۔ حمید ذاکیر نے سینکڑوں کو کلمہ سکھائے کلمہ سکھا دیا۔ لیکن ملن کی دوکان پر اسے سخت "زماکش" سے گزرنا پڑا۔ ملن کیمفٹ نے تو ہر قدم پر تنے سوال اٹھائے کہ حمید کیا کوئی مکی ہوتا اس کے چر اکھڑ جاتے۔ ہر سوال کا معقول جواب پانے کے بعد بھی اس کی موتی عقل میں یہ بات نہ آئی کہ آفراس زمانے میں یکا یک کیوں حق صاحب کو کلمہ سکھانے کا خیال آیا ہے۔ کالے خاں کو جب کلمہ سکھانے کی دعوت دی گئی تو اس کی اسماعیلی غیرت ایسی جوش میں آئی کہ اس نے حمید ذاکیر کو برلا ستائیں اور علی الاعلان کہا کہ "ہاؤ ہمیں کلمہ پڑھانے آیا ہے۔ اے ہم تجھے الناکھہ پڑھا دیں گے۔" کالے خاں کو دعویٰ تو یہی تھا کہ وہ کلمہ جانتا ہے مگر وہ قعد یہ ہے کہ اس نے محمد رسول اللہ کو ہمیشہ محمد رسول اللہ کہا۔ اب اس کی زبان کون پکڑتا۔ اس کے تو ہاتھ تک پکڑنے مشکل ہوتے تھے۔ شیرو سے جب کلمہ سکھانے کو کہا گیا تو پہلے تو حمید ذاکیر کو وحشت نہ انداز میں ٹھوڑا رہا۔ پھر بولا "یاد ہے۔ جا اپنے وکیل صاحب سے کہ دیکو کہ شیر و کو کلمہ یاد ہے۔" اور یہ فقرہ اس نے ایسے قطعی انداز میں کہا کہ حمید ذاکیر کو کچھ اور پوچھنے کی جرات ہی نہ ہوئی۔

عس کی دکان پر بیٹھنے والے دراصل کسی اور ہی فکر میں گرفتار تھے۔ ذریعہ کا حال اللہ بہتر جانتا ہے لیکن خبریں پل پل کی یہاں

پہنچی تھیں۔ یہ خبر منخوا بننے والے نے اڑائی تھی۔ کہ جزل موہن سنگھ کی فوجوں نے پنجاب فتح کر لی۔ عین اس خبر کو جھٹلا تو نہیں سکتا تھا۔ لیکن اس کا دل اندر سے کہہ رہا تھا کہ یہ خبر غلط ہے کالے خاں کا منہ اتنا سا نکل آیا۔ رفیہ کی بھی مٹی گم تھی۔ لیکن آخر اس عظم کو پھر رفیانے ہی توڑا۔ یہ خبر اسی نے آخر سائی تھی کہ گاما اپنے بھوں کو لے کر امرتسر سے نکل پڑا ہے پھر کیا تھا۔ سوکھے دھالوں پہ پانی پڑ گیا۔ کالے خاں مر کے جی اٹھا۔ لیکن عین اس کو ابھی اچھی طرح یقین نہیں آیا تھا۔ جب رفیانے اسے بتایا کہ گاما اور جزل موہن سنگھ کا ایک ایک پانی بھی ہو چکا ہے اور جزل موہن سنگھ نے دو فائر کئے اور دونوں گامانے اپنے سینے پہ روک لیے تو عین اس وقت پر بیان لانا ہی پڑا۔ منخوا بننے والا تو کسی طرح سے بچ بچا ہی نہ تھا لیکن جب اس نے لڑائی کی تفصیلات سنیں تو اسے سوائے یقین کر لینے کے اور کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ البتہ اسے یہ سن کر بہت سکون ہوا کہ جزل موہن سنگھ گاما کی مار سے بچ لکھا ہے اس کا اسلحہ سب سے زیادہ کالے خاں کو تھا لیکن رفیانے اسے اطمینان دے دیا کہ "کالے خاں میں بوکو ہوں کو سالانچ کے کہاں جائے گا۔" منخوا کی کئی دن تک بری حالت رہی لیکن جب سے یہ پتہ چلا کہ پٹیا۔ والے کی فوج بکڑ کر نکل کھڑی ہوئی ہے اور پنجاب کے مسلمانوں کا قتل عام کرتی ہوئی بڑھ رہی ہے تو اس کے چہرے پر پھر تارگی آ گئی۔ عین بنواڑی کی دوکان پر جب یہ خبر پہنچی تو ایک دم سب پہ اوس پڑ گئی۔ منخوا کی بات پر تو خیر کبھی بھی یقین نہیں کیا گیا۔ لیکن اس خبر کے راوی تو لارگو وریاں تھے۔ حق صاحب خود اپنے کالوں سے ان سے یہ سن کر آئے۔ ایسی صورت میں یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ کئی دن اور کئی راتیں بڑے کرب کے عالم میں گزریں۔ خبریں آتے آتے ایک دم سے بند ہو گئیں ہر شخص پریشان تھا۔ کسی کو کچھ بھائی نہ رہتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ اور دنیا کس طرف جا رہی ہے۔ آخر اس تذبذب کو ختم کرنے کا سہرا پھر رفیا ہی کے سر ہوا۔ اس نے عین کی دوکان پر پہنچ کر بڑے ڈرامائی انداز میں اعلان کیا۔ "لومبوں دس سالے پٹیا۔ والے کا تو کہہ ڈا ہو گیا۔"

سب کے سب چونک پڑے "کیسے؟"

رفیانے پڑے پر بیٹھتے ہوئے کہا کہ "اجی سارا پٹیا۔ والے گلند بنے تھا۔ مگر حیدر آباد کے لوہ نے بھی نیلے پہ وہا مارا۔ سب دھری رہ گئی سالے کی چار کی۔"

حیدر آباد کے نوات کے حوالہ نے ستم ڈھایا لوگوں کے اشتیاق میں روکن چوگنا اصف ہو گیا۔ کئی آوازیں ایک ساتھ نکلیں "یار بتانا کیا ہوا؟"

رفیا بڑے اطمینان سے ہوا۔ "ہاں ہاں یار بتاؤں ہوں۔ اے او عین مرغی والے کبھی کبھی تو اپنے داداؤں کو بیڑی پھا دیا کر۔"

رفیانے بروقت سواں ڈال تھا۔ عین نے جھٹ پٹ بیڑی نکال اسے تھائی۔ رفیانہ سے بیڑی لگاتے ہوئے بولا۔ ”میاں میں بھی تو کہوں کہ حیدر آہ کو کیا سانپ سونگھ گیا ہے۔ مگر دے بھی موقعہ کی تاک میں تھا۔“ یہ کہہ کے اس نے بڑے آرام سے بیڑی سٹکاٹی۔ لوگوں کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے تھا۔ لیکن رفیانے ان کے اشتیاق و ران کے اضطراب کا احترام کچھ ایسا ضروری نہ سمجھا۔ بیڑی سٹگانے کے بعد اس نے ایک زور کا کش لیا اور کہنے لگا۔ ”سالے پٹیا لے و لے نے چال چلی تھی کہ میری فوج مجھ سے بگڑ گئی حیدر آہ دکا لو ب کہاں چوٹے تھا۔ اس نے بھی اعلان کر دیا ہے کہ میری ایک ٹین باغی ہو گئی ہے۔“

”اچھا۔“ سب کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”ہاں۔“ رفیا بول۔ ”اب رہے گی برابر کی چوٹ۔“

”بربر کی چوٹ؟“ کالے خاں کے لبہ میں ایک حقارت کا پہلو بھی تھا۔ ”بھتی کی بدولا ہوا ہے۔ حیدر آہ تو منٹوں میں پٹیا لہکی فوج کو چھوڑ کر دے گا۔“

دراصل کالے خاں بہت ”گے“ نگہ جارہا تھا۔ عین ابھی پہلی سی منزل میں تھا۔ اس نے کالے خاں کی گفتگو کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیوں بے رفیا یہ خبرا خہر کی ہے؟“

”من رہے ہو جی اس سارے کی باتیں۔“ رفیا پرے مجمع کی قتل سے خطاب کر رہا تھا۔ ”اے گھاس کھا گیا ہے ایسی خبریں کہیں اخباروں میں آسکیں ہیں۔ حیدر آہ اسے سپہ میاں کا ایک دوست آقا تھا وہ کہہ رہا تھا۔ جھوٹ مانے تو جا کے سپہ میاں سے پوچھ لے۔“

کالے خاں بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ”مگر یار دوے حیدر آہ کی ٹین کدھر گئی ہے؟“

رفیانے ہر سوال کا بے ساختہ جواب دینے کا خمیہ کیا تھا۔ مگر اس سوال پہ شیشا گیا۔ لیکن یہ سواں اکیلے رفیانے سے نہیں تھا۔ سب ہی کچھ سوچ میں پڑ گئے تھے۔ عین اس انداز میں سر کھمارہا تھا گویا اس معرکہ کو سمجھانے کی ساری ذمہ داری اسی کے سر ہے۔ بہت سوچ ساج کر بولا۔ ”پہلے تو امرتسر کی طرف جائیں گی۔“

”ہوں۔“ رفیا بولا۔ اب تک امرتسر ہی میں بیٹھی ہیں۔ میاں اب تو دلی کو چل پڑی ہوں گی۔“

شیر و پہلے ٹنگی باندھے عین کو دیکھ رہا تھا۔ پھر رفیا کے چہرے پر اس کی نگاہیں جم گئیں۔ کالے خاں بھی کچھ کہنے کی نیت باندھ رہا تھا لیکن شیر کو جانے کیا ہوا ہے چین ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی دیکھا دیکھی اور لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور کالے خاں کے دل کی بات دل ہی دل میں رہ گئی۔

منہ کو جب یہ پتہ لگا کہ حیدر آباد کی ایک پٹنن و ستر پر چالوٹی ہے تو اس کے تو حواس باختہ ہو گئے۔ اسی عالم میں یہ خبر پہنچی کہ ہندوؤں میں آپس میں پھوٹ پڑ گئی ہے راجپوتوں نے سکواریں سوخت لی ہیں اور جاٹ کہتے ہیں کہ دلی سے لے کر میرٹھ تک ہم اپنی حکومت قائم کریں گے۔ منہوا کا متا تانا سا نکل آیا۔ جب دلی سے گزری خبریں آئیں تو وہ مطلق یہ نہ سمجھ سکا کہ جانوں نے دلی پر حملہ کیا ہے یا راجپوتوں نے بلہ بول ہے۔ یہ انکشاف رفیق نے کیا تھا کہ لڑائی ہندو مسلمانوں میں ہوئی ہے۔ یہ بھی اسی نے سنایا تھا کہ پہلے دن تو مسلمان بہت بچے۔ لیکن دوسرے دن میواتیوں نے بلہ بول دیا اور پورے کناٹ پٹیس میں آگ لگا دی پشاور سے پنڈلوں کے چل پڑنے کی خبر کوں لایا اور کہاں سے لایا اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کم از کم رفیق تو اس کا راوی نہیں بنا۔ اور منہو سے تو یہ توقع ہی نہیں کی جاسکتی تھی۔ بچے عیروں پر آپ کلہاڑی کون مارتا ہے۔ اس خبر سے اس کے تو پیٹ میں درد ہونے لگا۔ کالے خاں کا داغ عرش معنی پر تھا۔ سب تو وہ کالے آدمی سے بات نہیں کرتا تھا۔ البتہ طنز نے ذرا قنوطیت کا مظاہرہ کیا۔ کہنے لگا۔ "اماں بات یہ ہے کہ ہاتھ اپنی جگہ پہ بھاری ہو دے ہے۔ پنڈلوں کی دلی میں دال نہیں گلے گی۔"

اس پر کالے خاں بہت جڑا۔ "تو اس بھتیجی والے کی سنو۔ ابے پنڈت گئے جھنڈے گاڑ دیئے۔ میاں میں نے لڑائی میں یہ دیکھا کہ جہاں لڑ پٹھان لڑا۔ سالے گورے تو لونڈیوں کو پھرتے پھرتے تھے۔ میں تو یہ کون ہوں کہ گر پنڈانوں کی پٹنن نہ ہوتی تو اس لڑائی میں انگریزوں کا وہ گول تھا۔"

انگریزوں کی تذلیل پر صحن بہت گھٹا۔ بورا۔ "یہ انگریز کی بات مت کروں گا اور پٹھان کا کیا مقابلہ۔"

"لو بھو۔" کالے خاں کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ "یہ نکیا چونے سالے انگریز پنڈلوں کا مقابلہ کریں گے۔ میں وے تو کلزم لڑا دے ہیں۔ پنڈاں لڑتا ہے۔ دن سالوں نے خود مانا ہے کہ ہاں بھی لڑائی میں پنڈانوں نے بڑی بہادری دکھائی۔"

"دل بڑھانے کو کہہ دیا ہوگا۔" علس نے بے ساختہ جواب دیا۔

کالے خاں اور بھن گیا۔ "نوجی یہ چوٹی والے پنڈانوں کا دل بڑھا میں گے۔ ون کا دل تو خود قوتوری کا سا ہے۔"

رفیق بہت دیر سے خاموش بیٹھا تھا۔ آہراں سے رہا نہ گیا۔ بات کانتے ہوئے بورا۔ "کالے خاں چھوڑ بھی کس کے منہ لگے ہے۔ میں یہ کہوں اوں کہ دیر کوئی ہے۔ اب پٹھان آئے دیکھ لینا کیا ہوئے ہے میاں جب وہ دعا دعا کرتے آئیں گے تو سکھوں اور جانوں کی تو میاں مرجائے گی۔"

علس نے طنزاً جواب دیا۔ "ہاں جی چنگیوں میں دلی فتح کر لیں گے۔"

”یارے دیکھتا رہ۔ لال قلعہ پہ“

”اے یار گولی مار لال قلعہ کو۔ ڈرا بڑی تو پلا۔“ شیردہ بھی خاموش بیٹھے بیٹھے تنگ آ گیا تھا۔ رفیانے کوئی بہت ملاحظہ کا فقرہ کہنے کی نیت باندھی تھی۔ مگر شیردہ نے ٹنگوی مار دی۔ اس نے کان میں لگی ہوئی بیزی ٹکا کر جلدی سے شیردہ کے حوالے کی۔ یہ جگت اس نے شاید اس لیے برتی تھی کہ وہ جی بات پھر شروع کر دینی چاہتا تھا۔ لیکن شیردہ نے اسے موقع ہی نہیں دیا۔ اس نے بیزی منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”ساو بہت دون کی رے رے ہو۔ یہ بتائے دوں ہوں“ یہ کہتے کہتے وہ عین سے مخاطب ہو گیا۔ ”بے عین دیا سلائی دیکھو ہے۔“ عین نے اسے دیا سلائی کی زبید دے دی اور ساری نگاہیں شیردہ کے چہرے پر جم گئیں گو یہ وہ کوئی بہت بڑا کشف کرنے والا ہے۔ شیردہ نے اطمینان سے بیزی سلائی اور دیا سلائی کی بھی ہوئی تلی پھینکتے ہوئے بولا۔ ”نہو یہ بتائے دوں ہوں بڑا خون خرابا ہو گا۔“

چند لمحوں کے لیے سکوت چھا گیا۔ پھر کالے خاں تڑپ کر بولا۔ ”خون خرابا تو ہو گا۔ تو جو رو کے پاس دیک کے بیٹھ جائیو۔“ رفیانے ٹکڑا لگایا۔ ”اے یار کالے خاں امر تر دالوں سے تیرنی تو یاری ہے۔ وہیں لکھ بھیج کہ، ہور کو قتی چوڑ گیس بھیجہ میں دو چوڑ گیس ادھر بھی بھیجہ دو۔“

شیردہ نے کالے خاں اور رفیا دونوں میں سے ایک کے فقرے کا بھی اثر قبول نہیں کیا۔ بڑی بے اعتنائی کے ساتھ بولا۔ ”ہس ہم نے نہیں بتا دیا ہے۔“

اور شیردہ پھر کسی سوچ میں پڑ گیا۔ مجمع پر خاموشی چھا گئی۔ آخر کوئی ایک منٹ کے بعد عین بولا۔ ”یار شیردہ تو منہ زوری کیا کرے ہے۔“

کالے خاں بولا۔ ”یہ سارا پٹھانوں کو نہیں جانتا۔“ اور اس کے بعد اس نے پٹھان رجمنٹ کی بہادری کے قصے سنانا شروع کر دیئے۔ پھر رفتہ رفتہ رفیانے یہ محسوس کیا کہ کالے خاں کا جوش دھیمہ پڑتا جا رہا ہے۔ اس نے بڑی چھلندی سے گفتگو کا ذمہ اپنے سر پر اور سبیلین کے علم و فضل کے قصے سنانے شروع کر دیئے۔ پھر نامعلوم کسی وقت اور کس طرح پٹری بدی اور گفتگو کا موضوع سبیلین کی بجائے حق صاحب و نمبردار صاحب بن گئے۔

رفیا کہہ رہا تھا۔ ”یار مجھے تو اس پتا دے ہے کہ وکیل صاب کو کھڑے خود نہیں آتا اور دوسروں کو سکھاتے پھرے ہیں۔“

”یہ میں نہیں جانتا عین نے فوراً اس کی تردید کی۔“ میاں آخر کو تو وہ وکیل ہے اور پھر دس کی جی عمر ہے۔ تجھ سے تو وہ دگنا گنا بڑا

ہوگا۔ سر کے بال کچھڑی ہو رہے ہیں اور گلہ سے یاد نہ ہوگا۔“

”بھئی قسم اللہ پاک کی دے گلہ نہیں آتا۔ میاں میں تو بالکل ٹھیک گلہ پڑھوں اور وہ ہر مرتبہ ٹوک کے دے غلط کر دے۔“
”صد ہے یا۔“ کا لے خاں بولا۔

کا لے خاں کی تائید حاصل ہوئی تو رقی نے اور ہاتھ بڑھ پھیلانے۔ ”میرے تو جی میں آئی کہ کہہ دوں کہ وکیل صاحب پہلے خود گلہ دیکھ لو۔“

علین رفیقا کا فخر و نظر انداز کرتے ہوئے بول۔ ”پر مجھے تو فنی سرور پار پتا دے ہے۔ وہ بھی گلہ سکھاتا پھرتا ہے۔“

کا لے خاں نے فوراً اعتراض کیا۔ ”ہسنے کی کیا بات ہے بے۔ گلہ ہی تو وہ سکھلا دے ہیں۔“

”جو جی ہسنے کی بات ہی نہیں اسے۔“ علین تاؤ میں آ کر بولا۔ ”اماں محلہ بھر کا تو وہ محمول ہنم کئے بیٹھا ہے۔ قسم تلے محمد کی ادا کار

نہیں بیٹا سالا۔ فرسودہ پروپیہ چلا دے ہے۔ خود سود کھا دے ہے۔ دوسروں کو گلہ۔“

شیر و پھر چونکا در علین کی بات کانٹے ہوئے بول۔ ”علین میری بیٹیوں کا حساب کتنا ہوا؟“

”بڑا حساب کا جو کھا بن رہا ہے بے۔“ علین چمک کر بولا۔ ”انٹی سے پیسہ لکھتا نہیں۔ حساب پوچھے ہے۔“

”تو حساب تو بتا۔“

”تاؤ دوں گا ہیکل کو۔ بھی کیا تو دے دیا ہے۔“

”نہیں بے حساب و باقی کر لے۔ کل میں جا رہا ہوں۔“

”کہاں جا رہا ہے بے؟ لام پہ جائے گا؟“

رفیقا نے فوراً بات کاٹ دی۔ ”نام پہ جاوے گا بھڑوا۔ یاں سے ڈر کے جا رہا ہوگا۔“

علین نے پھر اصرار سے پوچھا۔ ”کہاں جا رہا ہے بے؟“

”دلی۔“

”دلی؟“

”ہاں دلی۔ دلی۔“ شیر و نے سمجھنا کر جواب دیا۔

کا لے خاں کا منہ کھل کا کھلا رہ گیا۔ رفیقا نے کئی مرتبہ بولنے کی ہمت کی لیکن اسے کوئی بات بن ہی نہ پڑی۔ آخر پھر علین ہی بور۔

"کیوں جا رہا ہے؟"

"تو پان بیڑی بیچ۔ تجھے اس سے کیا مطلب۔" اور یہ کہہ کے شیر داغھ کھڑا ہوا۔ چلتے چلتے وہ پھر بول۔ "میرا حساب دیکھ رکھیو۔ صبح آؤں گا میں۔" اور یہ کہہ کے شیر داغھ اپنی لاشی چٹا گھر کو چل دیا۔

کاے خاں کا منہ اسی طرح کھلا ہوا تھا۔ رفقا پر سکتہ کی کیفیت طاری تھی۔ غلن نے خواہ مخواہ پانوں پر پانی چھڑکنا شروع کر دیا تھا۔

دلی

۷ اگست

بڑی مشکل سے پاؤں ٹکانے کی جگہ ملی ہے اسے مکان کہنا تو کچھ سہانہ ہی ہو گا پاؤں ٹکانے کی جگہ ہی کہنا چاہیے۔ ایک زمانہ تھا کہ دلی میں رہنے کو جگہ مل جاتی تھی۔ کھانے کو نہیں ملتا تھا۔ اب یہ زمانہ ہے کہ یہاں نوکری مل جاتی ہے مکان نہیں ملتا۔ میں تو اس پر حیران ہوں کہ یہاں سے روز مسلمانوں کے قافلے پاکستان روانہ ہوتے ہیں۔ لیکن کیا محال کہ کسی مسلمان محلہ میں کوئی مکان خالی نظر آ جائے۔ لیکن تو پاکستان چھو جاتے ہیں مگر مکان کہاں جاتے ہیں۔ روز میلہ ڈھلتا ہے۔ جسے دیکھو تانا بانڈا سمجھ لے چلا جا رہا ہے۔ پانچھو کہ حضرت کدھر کو۔ جواب ملے گا۔ "میاں دلی میں رہنے کا دھرم نہیں رہا۔ پاکستان جاتے ہیں" اسٹیشن پر جا کر دیکھئے تو عجیب منظر نظر آئے گا۔ یوں نظر آئے گا کہ ساری دلی اسٹیشن پر ٹوٹ پڑی ہے۔ مگر گلوں میں جا کر دیکھئے تو مکان بدستور گھرے ہوئے ہیں یا لگی یہ ماجرا کیا ہے یا تو دلی والے ہی سلیقہ سے دلی خالی کر رہے ہیں یا پھر میں مکان حاصل کرنے کا سلیقہ نہیں آتا۔ بہرحال ہم یہیں ہیں اور دلی کے مسلمانوں کو پاکستان جانا ہے۔ کبھی تو ٹھکانے کا مکان ملے گا ہی۔

۱۲ اگست

اب تک تو میں مکان کی فکر میں سرگردان رہا تھا۔ مدرسہ کی حالت پر نظر ڈالنے کی فرصت ہی نہ ملی تھی۔ خدا خدا کر کے اب اس طرف سے سکون ہوا ہے سو مدرسہ کے حالات کا جائزہ لینا شروع کیا ہے دراصل میں کچھ ضرورت سے زیادہ رجائیت پسند ہو گیا تھا مدرسہ اسلامیہ والوں کے دعوے ہی دعوے تھے اس میں اور دوسری درس گاہوں میں مجھے کوئی بنیادی فرق نظر نہیں آتا۔ یہ ضرور ہے کہ مدرسہ والوں نے اپنے طرز تعلیم میں ایک نیا پن پیدا کرنے کی بری بھلی کوشش کی ہے مگر یہ نیا پن یہاں نہیں ہے کہ اس کی بنا پر ہندی مسلمانوں کی نئی پود میں کسی ربردست ذہنی انقلاب کی توقع کی جاسکے۔ رہا طلبہ کا معاملہ تو ان میں بھی مجھے کوئی خاص چمک نظر نہیں آتی۔ دلی کے ہم نے بہت ذکر اذکار سنے تھے۔ لیکن اب چکھا تو پتہ چلا کہ اس اونچی دوکان کا کچھ ن بھی خاصا چمکا ہے۔ علی گڑھ کے

لڑکوں اور دی کے نو جوانوں میں مجھے اس کے سوا اور کوئی فرق نظر نہیں آتا کہ موخر الذکر اردو اچھی بولتے ہیں۔ یہ قیاری صفت ہے کوئی وصف تو نہیں ہے۔

بہر حال میں تو یہاں آئی پڑا ہوں۔ علی گڑھ کے تالوں کے کاروبار سے یہ صورت بہر صورت بہتر ہے۔ وہاں تو کوئی بات سننے کا بھی روادار نہیں تھا اور کیوں ہوتا وہاں کی فضا تو حائل نعروں کی فضا ہے۔ علی گڑھ کے عظیم الفکر طلبا کو سوچی بچار سے کیا واسطہ۔ یہاں میں نو جوانوں تک کم رکم اپنی بات تو پہنچا ہی سکتا ہوں۔

۲۲ اگست

دلی خوب شہر ہو یا نہ ہو عجیب شہر ضرور ہے۔ معلوم نہیں لوگ باگ کیوں اس شہر کی تعریفوں کے پل باندھتے تھے۔ مجھے تو یہاں وحشت ہوتی ہے۔ یہاں کے در دیوار مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ میں اس شہر میں نیا نیا ہوں یا پھر واقعی یہاں کی فضا وحشت خیز ہے یہاں کے بازاروں میں عجیب ہنگامہ نظر آتا ہے۔ دلی کے شائقین شاید اسی ہنگامے کو چہل پہل بتایا کرتے تھے۔ مگر مجھے تو یہ سراسیمگی کا طوفان نظر آتا ہے۔ یہاں کے بازاروں میں چلتے ہوئے میں جس صورت پر نظر ڈالتا ہوں اس پر یا تو وحشت برستی نظر آتی ہے یا ڈر دلی کیفیت دکھائی دیتی ہے ایک عجیب بات یہ ہے کہ یہاں کی راتیں مجھے بڑی ڈراؤنی معلوم دیتی ہیں۔ علی گڑھ کی قنصلیں نہیں میر ہر جگہ یہ طور ہا کہ رات رات بھر سڑکوں پر گھومتا تھا اور علی گڑھ کی تو خیر بات ہی زردی تھی۔ نہ جانے وہاں میری کتنی راتیں سڑکوں پر گھومتے گئی ہیں۔ علی گڑھ کے ہواؤں کی خامی سے زندہ دل تھے۔ رات گئے تک دوکانیں کھولے رکھتے تھے اور پھر وہاں کا اسٹیشن تھا جو دن سے زیادہ رات کو تا با نظر آتا تھا۔ مگر یہ دلی عجیب شہر ہے۔ شام سے شہر میں سناٹا چھا جاتا ہے۔ سڑکیں سو حق کرتی ہیں۔ صفائیں سہا محسوس کرتی ہے۔ اکثر یوں ہوا ہے کہ میں چلتے چلتے خود اپنے قدموں کی چاپ پر چوٹا ہوں۔ ایک چیز جو مجھے یہاں بہت چوٹ لگاتی ہے۔ وہ کتوں کا رونا ہے۔ کتے راتوں کو ہر جگہ روتے ہیں۔ علی گڑھ میں بھی روتے تھے حسن پور میں بھی روتے تھے۔ مگر دلی کے کتے کچھ اتنی درد انگیزی سے روتے ہیں کہ دل خواہ خواہ دھڑکنے لگتا ہے۔ کئی مرتبہ میرے ذہن میں ایک عجیب و غریب سوال پیدا ہوا کہ دلی کے کتوں کی آواز میں اتنا سوز کیوں ہے اور راتوں کو ان پر گہر معمولی حد تک رقت کیوں طاری ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بڑے بڑے کتا سوال ہے اور مجھ جیسے بڑے جتنے آدمی کا اتنا دماغ ہی ایسے سوال کو جم سے سکتا ہے۔

۲۳ اگست

آج شام کو میں بہت دیر تک چاندنی چوک میں گھومتا رہا۔ اللہ کی قدرت کا تماشا دیکھا۔ ایک سے ایک اچھی صورت نظر آئی۔

دن کا پانی جو کسی زمانے میں بہہ کر ملتان چلا گیا تھا شاید اب بہہ کر دلی واپس آ رہا ہے۔ میرے لیے تو خیر یہ شہر نیا ہے۔ لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ دلی میں رنگ و نور کی سی فراوانی پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی۔ چاندنی چوک و اقہی چاندنی چوک بن گیا ہے۔ چاندنی صورتوں کا وہ جھوم ہوتا ہے کہ ہر ہر قدم پر ایمان و انگلی کی بازی لگانے کو ہی چاہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ جوتاب چوڑی ہوئی ابیا بن کر رہ گیا ہوگا۔ پاکستان اچھا بنانا ہو رکا پانی دلی کے بازاروں میں بہا بہا پھرتا ہے۔

مگر یہ عجیب بات ہے کہ اس کے باوجود دلی ویران سی نظر آتی ہے۔ چاندنی چوک کف مگروش بنا ہوا ہے۔ پھول تازہ بھی ہیں خوش رنگ بھی ہیں۔ پھر یہاں کی فضا کو یہ اتنی ویران نظر آتی ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ کہیں یہ اپنے ہی دس کی خانہ ویرانی تو نہیں ہے۔

۱۲ اگست

رات بہت دیر سے خیندا آئی تھی پھر مگی منہ اندھیرے آکھ کھل گئی۔ کلی کی منہ پر دو چپ کے مارے اور گھر سے نکل پڑ۔ تاروں کی چھڑوں میں ٹپکنے میں عجب حلق آتا ہے۔ مگر یہ دلی عجب بے لطف جگہ ہے۔ پر لطف چیزوں میں بھی لطف نہیں آتا۔ دلی کی صبح عجب تلخی سی ہوتی ہے۔ گھومتا گھومتا جمن گھاٹ کی طرف نکل گیا۔ وہاں جا کر بھی طبیعت بری نہ ہوئی۔ جمن بہتی تو کیا ہے بس اونگھتی ہے۔ پیسے نرم روپائی کو دریا کہنا مجھے تو کچھ زیادتی سی لگتی ہے۔ میں جنوبی ہند کے دریا دیکھے ہیں۔ کس زور شور سے بہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دکن کی ساری چٹانوں کو بہا کرے جائیں گے۔ دراصل مجھے نرم گرم اور ست رو چیزوں کو دیکھ کر کچھ خفقان سا ہوتا ہے۔ میں تو ہنگامہ اور حرکت چاہتا ہوں۔ سبطین کی جس بات پر مجھے غصہ آتا ہے وہ اس کے حراج کا دھماپن ہے۔ وہ سونے خواب دیکھنے کے اور کچھ جانتا ہی نہیں۔ مگر خواب بھی اودھ مرے ہوتے ہیں۔ اس سے اچھا تو اس کا ملازم رفیا ہے اور کچھ نہ سہی اس کی آواز میں گرمی تو ضرور ہے۔ سبطین تو زرا بھ ہوا انکار ہے۔ میں نے اسے ٹھیک ہی مشورہ دیا ہے کہ کسی لڑکی سے محبت کرو۔ بس وہ محبت ہی کر سکتا ہے اور وہ بھی لڑکی سے عورت سے نہیں۔ عورت سے لڑکے نہیں مرد محبت کرتے ہیں۔ معلوم نہیں سبطین کے گھر کے سامنے دن کا کیا حال احوال ہے۔ سبطین اسے عورت بتاتا تھا۔ اس کی سوچ بوجھ پہ مجھے اعتبار تو ہے نہیں مگر وہ غالباً عورت ہی ہوگی۔ اس کا طور یہی بتاتا تھا۔ مگی میں آتا ہے کہ ایک روز کے لیے حسن پور جاؤں اور اسے ایک نظر دیکھ لوں مجھے یقین ہے کہ وہ کسی خوبصورت نہیں ہوگی مگر اس میں ایک ٹھسا ضرور ہوگا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں وہ پاکستان نہ چلی گئی ہو۔ آج کل تو جس کے متعلق سوچئے وہ خندق کے پار ہی نظر آتا ہے۔ لوگ خامے ملتے ہیں علیک سلیک ہوتی ہے موسم کے حال پہ گفتگو ہوتی ہے۔ دوسرے دن ن کی خیر و عافیت پوچھتے تو پتہ چلتا

ہے کہ وہ تو پاکستان گئے۔ تو کیا مجب ہے کہ وہ بھی پاکستان چل دی ہو۔ مگر بارو گولی۔ میں اس کے بارے میں سوچ کیوں رہا ہوں۔ مجھے اس سے کوئی محبت کرنی رہی ہے۔ رہا یہ سوال کہ وہ عورت ہے یا لڑکی تو اس کا جواب خود بخود مل جائے گا۔ اگر بھٹین کا اس سے عشق ہو گیا تو وہ لڑکی ہے ورنہ عورت۔

۱۲۶ اگست

میں اس شہر کو جتنا دیکھتا ہوں اتنا ہی زیادہ مجھے یہ عجیب نظر آتا ہے آج مدرسہ کی چھٹی تھی میں حوض قاضی کی طرف نکل گیا۔ وہاں کی گلیوں میں بہت دیر تک بے مقصد گھومتا رہا۔ پھر چا زری ہو تا ہوا کوچہ پیٹان میں نکل گیا۔ کوچہ چیدان کوچہ ہے یا شیطان کی انت ہے۔ گلیں شوشوں کی طرح نکلتی ہی چلی گئی ہیں۔ خیر مجھے تو گھومنے سے مطلب تھا۔ مسلمان محلوں کا عجیب عام ہے جتنے مکان ہیں تنی کبوتروں کی پھتیریاں ہیں مگر اوپر سے کوئی دلی کو دیکھے تو ساری فضا میں مسجد کے میناروں اور کبوتروں کی پھتیریوں کا ایک جال بنا ہوا نظر آئے گا۔ جامع مسجد کے سامنے جیسے دیکھو مٹی میں کبوتر دبائے پھرتا ہے۔ جس کی مٹی میں کبوتر نہیں اس کے ہاتھ میں مالوں کا منجر ہوگا۔ مسلمانوں کا یہ حال دیکھ کر طبیعت بہت مضطرب ہوتی۔ سوچا تھا کہ چاندنی چوک چلو۔ طبیعت وری ہو جائے گی۔ ابھی یہاں قدم ہی رکھا تھا کہ ایک بزرگ ایک شہدے سے مصروف گفتگو نظر آئے۔ میں ٹھٹک گیا۔

کہہ رہے تھے۔ ”اماں خلیفہ فی ایہ بنے کا بچہ کیوں لیے پھرتے ہو؟“

شہدے کی مٹی میں یک سفید کبوتر دبا تھا۔ اس فخرے کو سن کر گرم ہوا بولا۔ ”خان صاحب۔ تم نے ہنر کے بچے پالے ہیں۔ کبھی کبوتر نہیں دیکھا۔“

خان صاحب غصہ سے پڑ گئے۔ کہنے لگے۔ ”تو میں نے کب پہلون دکھا داتا۔“

شہدا ور چڑھ گیا۔ ”اماں تمہارے مطلب کے بھی میں نے رکھ چھوڑے ہیں۔ اپنا دے لٹا ہے تیس کنجی آنکھوں والا اس کے چہرے پہ کیسوں دن آ جاتا۔ دے دوں گا کوئی سینے داسوں کا قیوتر پر اس وقت تو قیمتی قیوتر ہے اپنے پاس۔“

خان صاحب گرما گئے۔ ”اماں خلیفہ صورت دیکھ کے بات کیا کرو۔ میاں ہم نے تو پیسے کو ہمیشہ ہاتھ کا میل سمجھا۔ سوئیوں و لے محلہ میں دوکانوں کی مین کی مین تھی۔ سب کبوتروں اور شطرنج پہ ہی بیسٹ چڑھائی۔ وہ چھٹکا پہون ہے نادس کے جو گئے پہ دل آ گیا۔ دس لے گیا کہ ہنی کا لے آموں والی بغیا دے دو۔ ہم بھی ہوا کے گھوڑے پہ سوار تھے۔ قسم قبلہ شریف کی فور قہار لے لیا۔ تو میاں ایجا ناب سے ذریوں سنبھل کے بات کیا کرو۔ لاؤ دکھلو اوو کیسوں کہ کس برتے پہ اینتھ رنے او۔“

خلیفہ خاں صاحب کے ہاتھ میں کبوتر تھماتے ہوئے بولا۔ ”خاں صاحب لوٹن ہے لوٹن ذریعوں سے چھوڑو فردینکو کمال۔ قلاباز میں کھاتا ہوا آسمان پہ جاوے گا۔“

خان صاحب نے اس کی مات فوراً کاٹ دی۔ ”اہاں ہمیں نٹ کا تماشہ تھوڑا کی کرتا ہے قیوتر اڑتا ہے۔“

خلیفہ ہار مانے و راکب تھا۔ بولا۔ ”اڑان کی تو یہ سن لو کہ فجر کو دانہ کھل کے ارادہ بجز چوبیسوں گھنٹے اڑے گا اور رات میں بس کے دوسرے دن فجر کو چھتری پہ گرے گا۔ خان صاحب دس کی چوٹی دیکھو چوٹی۔“

خاں صاحب نے چوٹی دیکھی۔ پھر پنجوں کا جائزہ لیا۔ پھر اس کے باردوں کو پھیل کر دیکھا اور بولے۔ ”ہاں تو پہاڑاں بتا دو ٹھیک ٹھیک۔“

خلیفہ تن گیا۔ ”خان صاحب دی میں کوئی اس کا جوڑ نکال کے دکھاوے تو دس کی ہانگوں کے نیچے سے نکل جاؤں گا۔ اہاں، تھاق ہے۔ لکھنؤ میں ایک نواب صاب ہیں۔ ہمارے سب سے دن کی تو نکار ہے۔ پچھلے پندرہواڑے دے کھلھو گیا تھا انھوں نے دس سے یہ قیوتر دے دیا۔“

معلوم نہیں آگے اور کیا گفتگو سے مجھے ایسی کدوت ہوئی کہ فوراً ہی میں آگے بڑھ گیا۔ میں سوچتا ہوں کہ کیا یہ وہی دلی ہے جسے شاہجہان نے آباد کیا تھا۔

۱۲ اگست

کچھ بعد سامان تھا اس محلہ کا۔ دلی کے محلوں کے نام بھی تو کچھ عجیب سے ہیں۔ بہر حال دو کوئی محلہ تھا۔ ایک مکان پر میں نے ایک بورڈ لٹکا دیکھا۔ اس پر لکھا تھا۔ ”یہاں بارات کے لیے گھوڑے کراستے پرستے ہیں۔“

یہ بورڈ پڑھ کر ہنسی بھی آئی اور تعجب بھی ہوا۔ ہنسی اس پر آئی کہ دلی والے عمر میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور گھوڑے پہ چڑھ لیتے ہیں اور رنڈوؤں کو دوسری مرتبہ بھی یہ شرف حاصل ہو جاتا ہوگا۔ تعجب اس پر ہوا کہ دلی سے گھوڑے ابھی تک ناپید نہیں ہوئے ہیں اور بارتوں کے لیے ہی سہی گھوڑے مل ضرور جاتے ہیں۔

وہ سوال جو کل میرے ذہن میں پیدا ہوا تھا آج پھر کروٹ لے رہا ہے۔ کیا یہ وہی دلی ہے جسے شاہجہان نے آباد کیا تھا اور کیا یہ وہی دلی ہے جس کی سڑکیں آج سے سو سال پہلے بخت خاں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے گونج اٹھی تھیں۔ شاہجہان، دور اور رنگ زیب تو دنیا سے اٹھ ہی گئے۔ لیکن کیا کوئی بخت خاں اب بھی باقی نہیں ہے؟

۲۸ گشت

آج لال قلعہ جانے کا راہ کیا تھا۔ چار بجے مدرسہ سے چھوٹا اور سیدھا قلعہ کی طرف چلا۔ قلعہ یہاں سے خاصے فاصلہ پر ہے اور پھر یوں بھی میں پیدل چلنے کا قائل ہوں۔ پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ قلعہ کا دروازہ بند ہو گیا۔ میں وہاں سے ایندور ڈپارک پہنچا اور سڑک پر بیٹ گیا۔ ایک چمک والا میری طرف بڑھا۔ میں نے اسے پشکار دیا۔ یہ چمک بھی عجیب مذاق ہے۔ آدمی اچھا خاصہ گنڈاسا لگنے لگا ہے۔

جھپٹنا ہو چلا تھا۔ دونوں وقت مل رہے تھے۔ دور سے کسی مندر کے گھنٹے کی آواز رک رک کر بڑے باقاعدہ انداز میں آرہی تھی۔ جامع مسجد سے اذان کی آواز کچھ یوں بلند ہو رہی تھی جیسے کوئی لوح پڑھا جا رہا ہو۔ قلعہ کی دیواریں چپ چاپ کمزری تھیں اور اس کی برجیوں اور نگراں پر اندھیرا پھیل رہا تھا۔ میں لینے لینے وقت کی نیرنگی پر غور کرنے لگا۔ زندگی کے کیسے کیسے پر شوکت مظاہرے اس کے ایک اشارے پر فساد و افسوس بن کر رہ جاتے ہیں۔ شاہجہان کے وقت میں بھلا کس کے ذہن میں یہ بات آئی ہوگی کہ قلعہ کی فصیح کی یہ ساری گہما گہمی یہ سارا ہنگامہ ایک روز موت کے ستارے میں فرق ہو جائے گا اور خود لال قلعہ ایک خاموش مرعبے کی شکل اختیار کرے گا۔ آج سے سو سال پہلے اس برعظیم کے گوشہ گوشہ سے یکا یک ایک شورا تھا اور اس شور کی دھمک سے اس قلعہ کے در و دیوار مل گئے۔ پھر یہ شور ختم کیا درایہ تھا کہ لال قلعہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا، تنگ ہو گیا۔

میں سوچنے لگا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ خاموشی ایک مرتبہ پھر نہ ملے۔ کوئی کالے خاں ایک مرتبہ پھر اس قلعہ کی فصیح پر کھڑے ہو کر گوسے پھینکے اور جتنا کے خاموش پانی میں شور پیدا کرے۔ مگر اس شہر میں اب کالے خاں اور بخت خاں کا ہے کو پیدا ہوں گے یہاں کے خاں اور غلیف تو کہو تراڑنے کو زندگی کا سب سے بڑا مظاہرہ دیکھتے ہیں۔

شام کے جھپٹنے میں یوں بھی فصیح میں ایک سوز ایک درد کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور آس پاس کوئی تاریخی کھنڈر ہو تو اس سوز میں دو گنا چو گنا اضافہ ہو جاتا ہے اس وقت لال قلعہ کو دیکھ کر مجھ پر وہ کیفیت گزری۔ جو چاند کو کہتا ہے دیکھ کر گر رتی ہے۔ چاند گہن میں تپش سے زیادہ سوز کی کیفیت ہوتی ہے وہ ایک کرناک کیفیت ہوتی ہے۔ لیکن اس میں آواز نہیں ہوتی۔ ارتعاش نہیں ہوتا۔ اس وقت میری آنکھوں میں جھپٹنے میں ڈوبے ہوئے وہ لال قلعہ کے در و دیوار پھر رہے ہیں اور مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ چاند آسمان پر خاموشی سے کرب کے عام میں گہنا چلا جا رہا ہے۔

۲۹ اگست

اب تو دلی کی فضا میں سانس لینا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ راتوں کو گھومنے کا سلسلہ اب تقریباً ہو چکا ہے۔ سپاہی قدم قدم پر ٹوکتے ہیں۔ دن میں گھومنے کی اس بے فرصت نہیں ملتی کہ عرس میں سر جو کا پڑتا ہے۔ آج چھٹی تھی۔ میں مہرولی کی طرف چل نکلا۔ معصوم نہیں کیوں آج مجھے دلی میں پہلی مرتبہ بس میں سوار ہونے کا خیال آیا مگر پھر میں اس خواہش پر غالب آ گیا۔ اپنی ٹانگوں میں ابھی دم ہے اور ٹانگوں میں دم ہوتے ہوئے بس اور ٹرام کی سواری کی تک میری کچھ میں نہیں آتی۔

حضرت نظام الدین اولیا کے حزار سے آگے بڑھا تو ایک خستہ حال دروازہ نظر آیا اس پر لکھا تھا۔ "مدفن غائب" میرے جی میں آئی کہ ایک کوئلے کا کٹرا اٹھ اٹھ اٹھ اور اس کے نیچے لکھ دوں۔

یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ حال کی ہے

مگر پھر میں نے سوچا کہ کس رند شاہ باز کے لیے یہ تکلیف مول لیتے ہو۔ میں آگے بڑھ گیا۔ چلتے چلتے میں سوچنے لگا کہ یہ غائب کے یہاں موت کی اتنی شدید خواہش جو ملتی ہے وہ اس کی انفرادی خواہش ہے یا کسی اجتماعی خواہش کی ترجمان ہے۔

حضرت نظام الدین اولیا کے حزار سے لے کر قطب بنارنگ ویرانی ہی ویرانی نظر آتی ہے۔ قدیم شکتہ و رتوں کے سلسلے حد نظر تک پھیلے ہوئے ہیں۔ جا بجا شکتہ حال مقبرے اور کاہی آلود گنبد دکھائی دیتے ہیں۔ چپ چاپ ادگھتے ہوئے گدھوں نے ان مقبروں کی ویرانی میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ویرانی دلی کے کس گوشے میں نہیں ہے ایک مہروں پہ موقوف نہیں مجھے تو دلی کی پوری فضا میں موت کے سائے کا بچتے نظر آتے ہیں۔

۳۰ اگست

دلی کی مہاری کا بہت شور سنا تھا۔ آج میں نے اسے بھی چکھ دیکھا۔ دونوں لے کھانے کے بعد کیفیت یہ ہوئی کہ زبان من ہو گئی اور ناک سے پانی بہنے لگا۔ دس دالوں کی زندگی میں سے تیزی اور گرمی غائب ہو چکی ہے۔ اس کی کمی وہ اب یوں پوری کر رہے ہیں۔ اس شہر میں آ کر میں بری طرح مایوس ہوا ہوں۔ بھلا یہاں دالوں سے کیا توقع کی جائے وہ غریب تو دوسری کام جانتے ہیں۔ نہاری کھاتے ہیں اور کبوتر اڑاتے ہیں۔ بھلا ہوا کہ مثنوی زہرِ عشق یہاں نہیں لکھی گئی۔ ورنہ یہ لوگ تو کوٹھوں سے کود کود کر جانیں دے دیتے۔ خیر وہ زندہ تو اب بھی نہیں ہیں۔

کیم تبصر

اگست ختم ہوا۔ وہ مہینہ جس نے برصغیر کی تاریخ میں ایک نئے دور کا افتتاح کیا۔ آج شہر شروع ہوا ہے۔

آج صبح آنکھ کھلتے ہی ایک ایسا واقعہ دیکھا کہ سارا دن جی اداس رہا۔ میرے کمرے کے میں سامنے والے مکان میں کبوتر پے ہوئے ہیں۔ صبح میری آنکھ ذرا دیر سے کھلی تھی۔ آنکھ کھل گئی پھر بھی میں ذرا کروٹیں بدلتا رہا۔ سامنے والی چھت پر کبوتر دانہ چگ رہے تھے۔ ایک سفید کبوتر سب سے اگے منڈیر پر چپ چاپ اور اسردہ سا بیٹھا تھا۔ اچھے میں کوئی چیز تیر کی طرح اس پر چھٹی اور اسے اٹھا کرے گئی۔ یہ ہے تو بڑا معمولی سا دھندلی کے کبوتر بازوں کے منہ معلوم کتنے کبوتر روز بیروں کی نذر ہو جاتے ہیں مگر مجھ پر اس واقعہ کا دن بھرا اثر رہا۔ اس کبوتر کی اداس صورت رورہہ کر یاد آتی رہی۔

۲ ستمبر

آج ایک دہائی بزرگ سے ملاقات ہوئی کہتے تھے کہ شہر کا مہینہ دلی کے لیے منحوس ہے۔ ۱۸۵۷ء میں بھی شہر ہی کے مہینہ میں دلی پر آفت آئی تھی۔ گویا دلی والے کبوتروں لالوں اور چنگلوں کے ہی رہے نہیں ہیں تو ہم پرستیوں میں بھی جتلا ہیں۔ میں نے انہیں بے ساختہ جو بیا کہ "دلی اب نہ وہی ہے نہ یہاں کوئی بہادر شاہ ظفر بیٹھا ہے اب یہاں کوئی چیز تباہ ہونے کے لیے باقی ہے۔" دہائی بزرگ گرم ہو کر بولے۔ "اے جناب ہماری دلی کو آپ نے کیا سمجھا ہے اس میں اب بھی بہت کچھ ہے۔ مرا ہاتھی سولہ کھ کا۔"

ان لوگوں سے کوئی کیا بات کرے۔ ہر بات پر کوئی ضرب المثل کہڑا لیتے ہیں کوئی محاورہ جڑ دیتے ہیں۔ میں یہ پوچھتا ہوں کہ دلی میں اب مگر غدر پڑے تو کبوتروں کی کابھوں اور لالوں کے بچروں کے علاوہ اور کیا چیز تباہ ہوگی۔

۳ ستمبر

آج شام کو جب میں چٹلی قبر سے گزر رہا تھا۔ ایک فقیر کود بکھا۔ میلے کپیلے پہنے کپڑے۔ لب تڑکا۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ پاٹ دار آواز۔ پیسبر نہ انداز میں اعان کرتا چلا جاتا تھا کہ "چاند گرہن پڑے گا۔ دان دو۔" معلوم نہیں یہ فقیر کون سے چاند گرہن کا ذکر کرتا تھا۔ چاند گرہن تو پڑ رہا ہے۔ امرتسر سے کلکتہ تک مجھے تو گھن ہی گھن نظر آتا ہے۔ پاکستان کا پتہ نہیں ہے وہ اب میرے لیے دوسرا ملک ہے۔

۴ ستمبر

دلی کی فضا رور بروز مکدر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ کچھ فضا خود مکدر ہے۔ کچھ افواہوں نے اسے مکدر کیا ہے۔ رات کو ٹپکنے کا دھرم اب

بالکل نہیں رہا۔ اب تو یہ کیفیت ہے کہ چرغ میں جتنی پڑی ادھر ہم نے ہسٹر سنبھالا۔ لیکن نیند رات گئے تک نہیں آتی۔ عجیب بات یہ ہے کہ دن کے کتوں نے دفعتاً رونا بند کر دیا ہے۔ فضا میں ایک سناٹا طاری رہتا ہے۔ لیکن یہ سناٹا تو کتے کے رونے کی آوازوں سے بھی زیادہ ڈراؤنا ہوتا ہے۔

بوجی نے تو کسی کے بارے میں تخصیص نہیں برتی تھی۔ سبھی محلہ والیوں کو بلاوا بھجوا یا تھا۔ مگر گلشن نے واقعی تخصیص برتی۔ بہت سے گھروں کے بارے میں تو اس نے سرسری ٹالا۔ اور حمید ذاکیر کی بیوی بلوکی تو دلہیز کو بھی اس نے نہیں چھوا۔ ہاں نمبردارنی سے وہ خاص طور پر کہہ کر آئی کہ ”نمبردارنی صاب آج مجلس ہے۔ تم نہ آئیں تو بوجی بہت برا مانیں گی۔ اور سویرے سے ”یو“ فرد کو ٹھے والی کے سسد میں بھی اس نے ہتمام برتا تھا مگر اس میں دقت ہی کیا اٹھانی پڑی ہوگی۔ سامنے ہی تو اس کا مکان تھا۔ پھر گلشن کو یہ بھی پتہ تھا کہ وہ بڑی تک چڑھی ہے اگر خاص طور پر اس سے نہ کہہ گیا تو وہ نہیں آئے گی بلکہ کئی ایک مرتبہ تو گلشن نے بوجی سے حکایت بھی کی تھی۔ ”اے بوجی یہ فرد کو ٹھے والی تو ٹھے میں مری جاوے ہے۔ مئی کا قصم منہ تیں لگاتا اس پہ یہ حال ہے کہیں ہوتا کچھ تو یہ تو زمین پہ قدم نہیں رکھتی“ خیر یہ تو گلشن کا تکلف تھا ورنہ فرد زمین پر قدم تو اب بھی نہیں رکھتی تھی۔ فرد کو ٹھے والی دراصل افسری فاطمہ تھی۔ قاعدے کی رو سے افسری کو بگڑ کر ابونا چاہیے تھا لیکن یا تو عرف کی کوئی قوا اٹھ ہوئی ہی نہیں یا پھر بوجی نے اس کی پابندی لازمی نہ سمجھی۔ انہوں نے افسری کو بے سوچے سمجھے فرد کہنا شروع کر دیا۔ چونکہ وہ اوپر کے مکان پر رہتی تھی اس لیے کو ٹھے والی کا ٹکڑا اس کے عرف کے ساتھ اسی طرح جوڑ دیا گیا جس طرح شاعروں کے قلم کے ساتھ دہلوی دریا بادی بندھیا لوی قسم کی دھیں لگائی جاتی ہیں۔ بہرحال اس نام پر اعتراض کچھ بھی کئے جا نہیں یہ ماننا پڑے گا کہ اس میں بندش کی جتنی اور ایک قسم کی حرکت اور گرمی ضرور ہے بلکہ فرد کا لفظ تو جہاں خاصا جوش کا شعر معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ عرف متاع عام نہیں ہوا کہ لوگ اصل نام ہی کو بھول جاتے۔ آخر بوجی اسی بیٹے کی تو ماں تھیں جس کی اسلامی عوامی انقلابی تحریک ہزار کوششوں کے باوجود قبول عام حاصل نہ کر سکی۔ لیکن دراصل عرف کی کامیابی اور ناکامی میں اصل ناک کا بھی بہت کچھ دخل ہوتا ہے۔ جو نام نام والے کی شخصیت سے میل نہیں کھاتے انہیں تو عرف اس بری طرح ناکرتے ہیں کہ ان کا نام و نشان بھی پھر نہیں ملتا۔ بلوکی مثال موجود ہے اور تو اور محلہ بڑی بوڑھیوں تک کو یہ معلوم نہیں تھا کہ بلو کا اصل نام کیا ہے نمبردارنی تو یک ایک کی سات پشتوں تک سے واقف تھیں لیکن بلو کا اصل نام تو وہ بھی کبھی نہیں بتا سکیں۔ لیکن ایسے نام بھی ہوتے ہیں جن کا نام والے سے اتنا گہرا تعلق ہوتا ہے کہ وہ زیر زیر تک کی تبدیلی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ایسے ناموں پر عرف بھلا کب غلبہ پا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رفیا جس نے ہر محلے والے کے نام کو بگاڑا تھا رفیا خاں کے نام میں کبھی ایک نقطہ کی بھی تبدیلی نہ کر سکا۔ کبھی

شخصیت والوں کا ذکر نہیں ہے۔ ان کا نام رور نام بدلے رور ایک نیا عرف رکھنے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایسے لوگ ہر نام ہر عرف اور ہر لقب کو بے چون و چرا قبول کر لیتے ہیں۔ فضل حق وکیل کا نام اگر ابو الحسن یا محمد عمر یا رضا علی ہوتا تو اس سے کیا فرق پڑتا۔ لیکن لو ابن تو لو ابن ہی تھی حالانکہ دنیا کو معلوم تھا کہ اس کے مرحوم شوہر نے تو خود نواب تھے نہ کسی نواب کے دربان تھے۔ خیر یہاں تک تو ہم ایک اصول قائم کر سکتے ہیں کہ عرف وہ مقبول ہوتا ہے جو شخصیت کی پورے طور پر نمائندگی کرتا ہے۔ مگر عرف ظہور میں کیسے آتے ہیں اس کے متعلق کوئی کلیہ قائم نہیں کیا جاسکتا۔ افسری تو اپنے نام کی بنا پر فردوسی تھی۔ مگر بلو اور نو ابن کسی بنا پر اور نو ابن نہیں اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ پھر نمبر دارنی تو نمبر دار کی بلیدہ ہونے کی وجہ سے نمبر دارنی کہلائی لیکن بوجی ڈچن کیوں نہیں کہلائی حالانکہ اپنی صاحب کا بڑا نام تھا اگر ن کی آل اولاد بہت سی ہوتی اور محلہ میں کیزے کوڑوں کی طرح بیک بیک چھرتی تو مان لیا جاتا کہ چلنے کثرت نے بوجی کہنا شروع کر دیا وہ بوجی بن گئیں۔ حالانکہ اسی بیٹے نے جب اسلامی حوامی انقلابی تحریک شروع کی تو کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا خیر ذکر تو افسری کا تھا۔ دراصل افسری کی شخصیت کچھ اس قسم کی تھی کہ اس کا اظہار پورے طور پر نہ تو افسری فاطمہ کے نام کے وسیع ہوتا تھا ورنہ فرد کو ٹھے والی کے عرف کی وساطت سے ہوتا تھا بلکہ دونوں کو ملائے حب کچھ پتہ چلتا تھا کہ یہ کس قسم کی عورت ہوگی۔ غالباً یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ نام اور عرف دونوں اس کی غمازی کر رہے ہیں کہ وہ لڑکی نہیں بلکہ عورت تھی یہ لگ بات ہے کہ اس کی عمر سی زیادہ نہیں تھی۔ یہی کوئی ستائس اٹھائیں سال کے پٹے میں ہوگی۔ البتہ اس میں جو ایک قسم کی تمکنت اور وقار تھا اس کا پتہ اس کے عرف سے نہیں بلکہ نام سے چلتا تھا فیاض خاں کا قیاس ایک حد تک درست ہی تھی۔ وہ واقعی سی زیادہ حسین و جمیل نہیں تھی لیکن وہ سچ دھج کی عورت ضرور تھی۔ بدن چمرے اتونہیں تھا لیکن ایسا بھاری بھی نہیں تھا۔ چوڑی ہڈی الباقہ کھلتا ہوا رنگ سید بھرا بھرا۔ کمر بے شک پتلی نہیں تھی لیکن کمر سے لے کر گردن تک کے خطوط بڑے ترشے ہوئے نظر آتے تھے۔ "کھیں شرتی تھیں۔ شرتی آنکھوں میں وہ سیاہ آنکھوں والی چمک دمک تو نہیں ہوتی لیکن کبھی کبھی ان میں ایک سنجیدہ قسم کا غم اور ضرور ہوتا ہے اور افسری کی بڑی بڑی شرتی آنکھیں اس کیفیت کی حامل تھیں لیکن اس کی شخصیت میں سب سے پراثر اور جاذب توجہ تو اس کے چہرے کی وہ کیفیت تھی جو یہ کہتی نظر آتی تھی کہ یہ ارد گرد کی ساری چیزیں سچ ہیں۔ اس جسم کو دیکھو جو جسم بھی ہے اور جسموں کا مرکز قفل بھی ہے جسم بھی دراصل مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض جسم تو سرے سے جسم ہی نہیں ہوتے دوسرے الفاظ میں یوں کہتے کہ ایسی عورتیں بھی ہوتیں ہیں جو جنس نہیں ہوئیں محض صنف ہوتی ہیں اور بعض جسم جسم بھی ہوتے ہیں اور جسم سے بڑھ کر بھی کچھ ہوتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر بس یہ جی چاہتا ہے کہ سجدے میں جھک جائیے یا آرتی اتارنے لگے۔ ان سب سے الگ ایک جسم ایسا بھی ہوتا ہے جسے دیکھ کر آدمی مرعوب جی چاہتا ہے کہ سجدے میں جھک جائیے یا آرتی اتارنے لگے۔ ان سب سے الگ ایک جسم ایسا بھی ہوتا ہے جسے دیکھ کر آدمی مرعوب

ہو جاتا ہے افسری شہید کچھ اسی قسم کی عورت تھی وہ جس مکان میں رہتی تھی وہ کچھ اس زاویے سے واقع تھا کہ کمرے کی کھڑکی سبیلین کی بیٹھک کے عین سامنے نکلتی تھی۔ یوں سبیلین کے پاس بیٹھنے والے سارے مرد اس کی نگاہوں کی زد میں رہتے تھے لیکن وہ تو کبھی کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتی اور سبیلین سے جب دو تین مرتبہ اس کی نگاہیں چار ہوئیں تو خود سبیلین ہی کی نگاہیں جھک گئیں اس نے تو شرماء کر منہ چھپایا اور نہ نگاہ بازی کی۔ فیاض خاں دلی جاتے ہوئے اگرچہ وہاں صرف ایک رات ٹھہرا تھا۔ لیکن افسری کی نگاہ سے وہ بھی نہ بچ سکا۔ افسری ہر ایک کا جائزہ ضرور لے سکتی تھی اثر لے لے۔ یہ پتہ نہیں کہ اس نے فیاض خاں کا صرف جائزہ لینے پر قناعت کی تھی یا کچھ اثر بھی لیا تھا۔ وہ تھی بھی تو اتنی گہری کہ آسانی سے چٹائی نہیں کھاتی تھی شوہر سے اس کے کیسے تعلقات تھے یہ تو شاید محلہ میں صحیح طور پر کسی کو بھی پتہ نہیں تھا۔ بہت یہ سب جانتے تھے کہ اس کا شوہر اوجیز عمر کا آدمی ہے اور اس پر آشوب زمانے میں جب کہ ڈاڑھی والوں پر اپنی ڈاڑھیاں دار ہو رہی تھیں اس نے ڈاڑھی چھوڑ دی تھی۔ اور یہ کہ اس کے دن میں بارہ گھنٹے باہر صرف ہوتے تھے۔ کاروبار میں مصروف رہتا ہے یا وہابی تو ابھی پھرتا ہے اس کا کسی کو علم نہیں تھا۔ کہنے والے یہ بھی کہتے تھے کہ میاں بیوی میں ملتی نہیں ہے۔ البتہ اتنا تو ظاہر تھا کہ وہ شوہر کا احترام مطلق نہیں کرتی تھی وہ تو شاید اس کے وجود ہی کو نہیں گردانتی تھی۔ مگر سوال یہ ہے کہ وہ سوائے اپنے کس کے وجود کو گردانتی تھی۔ گلشن کی رائے اس کے بارے میں سو فیصدی درست تھی۔ وہ صرف تک چڑھی ہی نہیں تھی کل گہری بھی تھی اس کی شکایت محلہ کی ہر بی بی کو تھی۔ مگر اس نے بھی اس کاں سا اور اس کاں اڑایا البتہ بوٹی کا وہ تھوڑا بہت احترام ضرور کرتی تھی۔ اوس تو بوجی غریب تھیں اللہ میاں کی گائے۔ پھر یہ کہ جب پاس پڑوس ہوتا ہے تو کچھ نہ کچھ راہ و رسم ہو ہی جاتی ہے۔ شاید در کہیں سے بلا آتا تو افسری اسے خاطر میں نہ لاتی۔ لیکن بوٹی کے یہاں وہ عین وقت پر پہنچی۔

گلشن نے یہی کہا تھا کہ مغرب کے فوراً بعد مجلس شروع ہو جائے گی۔ افسری مغرب کے فوراً بعد تو نہیں لیکن تھوڑی دیر بعد ضرور پہنچ گئی تھی۔ لیکن مجلس کے وہاں ابھی کوئی آثار نہ تھے۔ البتہ چند ایک دیوایاں بہت زور شور سے گفتگو میں مصروف تھیں۔ افسری نے انہیں بڑے لیے دیئے پن کے ساتھ سلام کیا۔ نمبردارنی کو اس کی یہ روش مطلق نہ بھائی۔ وہ ہر نو جوان عورت سے یہ توقع رکھتی تھیں کہ وہ نہیں دیکھ کر بچہ بچہ جائے گی۔ بوجی کے مطالبات مختصر تھے۔ انہوں نے اس لیے دیئے سے سلام کو بھی غنیمت سمجھا۔ پھر انہیں میزبانی کا فرض بھی تو دا کرنا تھا۔ بولیں۔ "اے فردا چھی تو ہے۔ بی بی تو مانس گند ہو گئی۔ دیوار سے دیوار ملی ہوئی ہے۔ مگر کیا مجال کہ کبھی صورت دکھا دے۔"

"بوجی کیا بتاؤں۔ کئی دفعہ ارادہ کیا کہ آپ کے پاس آؤں مگر پھر فرصت ہی نہ ملی۔"

”اے جا رہے بھی دے۔ فرصت کو چبے کوٹنا کام پھٹ پڑا۔ بال نہ بچے جینی تو ہم سے ملنا ہی نہ چاہتی ورنہ ڈوبا یا کیا تھا کہ وقت ہی نہ ملتا۔“

نمبردارنی شاید موقعہ کی تاک میں تھیں۔ فوراً شروع ہو گئیں۔ ”اے غور آج کل کا زمانہ ہی یہاں ہے۔ اب وہ اگلے زمانے کی محبتیں کہاں ہیں۔ اے بونٹی تم نے تو ہماری ہوا کو دیکھا تھا۔ کیسی لطیف طبعیت کی تھیں۔ کسی کی کسی ویسی خبر سن سکتی تھیں تو تڑپ جاتی تھیں۔ فوراً دیکھنے کو جاتی تھیں۔ مگر آج کل کی لوندیوں کی آنکھ میں مروت نہ دل میں محبت۔ خوں سفید ہو گیا کسی کا دم چلنے لگے تو یہ منہ میں پانی بھی نہ ڈالیں۔“

یہ تقریر کرتے ہوئے نمبردارنی غالباً یہ بھول گئی تھیں کہ ان کے پاس ہی ان کی جینی فرصت بیٹھی ہے جو ہنی کا بھیت کو برقرار رکھنے کے لیے یہ ضروری سمجھتی تھی کہ ماں کو اپنے کمرے میں بار یا ب ہونے دے۔ مجلس سے تو اسے کیا دلچسپی تھی۔ مگر کبھی کبھی وہ یہ ثابت کرنے پر بھی تو مائل ہو جاتی تھی کہ ایک کالج کی روش خیال لڑکی بھی دنیا لوسی رسموں کو برداشت کر سکتی ہے۔

لیکن ہونے نمبردارنی کو چھ جواب دیا۔ ”اے چلو رہے مگر دو۔ آجکل تو بس دوری بھلے ہیں۔ نہ ملیں گے نہ جوتوں میں دال بنے گی۔ مٹے ایسے ملنے پہ خاک۔“

بوجی کو بلو کا یہ قنوطی انداز پسند آیا۔ کہنے لگیں۔ ”اری بلو یہ تو تیری خواہ خواہ کی بات ہے۔ بھی برتن جب ملیں گے تو کھٹکیں مگر بھی۔ ایہ کونسا گھر ہے جس میں بات نہیں چلتی چوہوں سے کان تو کٹائے نہیں ہیں کہ بات ہی نہ کریں۔“

”مگر بونٹی بات کا بھی تو طریقہ ہو دے ہے۔ آج کل کے لوگ کئے مرے ہیں۔“

”اے رہتے بھی دے کیا کئے مرے ہیں۔“

ہوا گر ذرا دیر کر دیتی تو بوجی نے مورد چہ فح کر ہی لیا تھا۔ لیکن اس نے فوراً پیٹر ابدلا۔ اور سیست کے میدان میں جا بیٹھی۔ ”اوئی بونٹی تم تو آنکھوں دیکھتے کھسی نگو ہو۔ دیکھتی ہو نا کیا آفت نافت اٹھ رہی اے۔ سار ملک ترا ترا ہو گیا۔“

اس آفت نافت کی توجیہ نمبردارنی نے کی۔ ”اچی میں تو جانوں کسی نے اس ملک میں سپہ کا کاٹا گاڑ دیا ہے۔“

ہونک کر بولی۔ ”اچی گاڑنے کو کیا جنید خاں آئے تھے۔ یہی کلوا فرنگی ہے بس کی گانڈ۔“

فرنگی کے لفظ پہ بوجی کو فوراً اندر یاد آ گیا ”اے ہے ان کبھتی مارے گوروں نے تو خدر میں بھی بہتری آفت بونٹی تھی۔ موائے جنیں کب یاں سے دفان ہوں گے۔“

فرحت اس بحث میں شریک ہونا اپنے شایان شان نہیں سمجھتی تھی۔ لیکن بوجی کو بے خبری کو دیکھ کر اس سے رہانہ گیا۔ آخر بوجی ہی پڑیں۔ ”بوجی آپ کو کسی دنیا میں رہتی ہیں۔ انگریزوں کی حکومت تو ختم بھی ہو چکی۔ ہندوستان اور پاکستان کو آزادی مل گئی ہے۔“

آزادی کے لفظ پر نمبردارنی بہت پھریں۔ ”آزادی۔ آزادی۔ اس لمبی حرامزادی آزادی کی تو ناک چوٹی کاٹ کے جوتیش مار مار کے باہر دھکے دے دیئے جائیں۔ چھ سال نے آتے ہی خون ٹھج کر ادیئے۔“

خون ٹھج کر لفظ سن کر نوادین کے جسم میں قہر قہری پیدا ہو گئی۔ دہشت زدہ آوار میں بولی۔ ”ارے بھئی بڑی قیامت اٹھ رہی ہے۔ پنجاب میں تو نو نیزے پانی چڑھا رہا ہے۔ اور شیش ہیں کہ دلی میں بھی۔“

دلی کے متعلق بلو کو کافی معلومات تھیں۔ اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ بات کانٹے ہوئے بولی۔ ”اے شیش کیا۔ ڈانخ خانے میں تو گھڑی گھڑی کی خبر آ رہی اے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ دلی مسلمانوں کی لاشوں سے پٹی پڑی ہے۔“

یہ فقرے سن کر بوجی کا سار جسم کانپ اٹھا۔ نمبردارنی نے حاک اثر نہ کیا۔ چمک کر بولیں۔ ”اجی ہنجا بی تو ہمیشہ کے لڑکے تھے مگر موئے دلی والوں کو لڑنے کی کیا ہڑک اٹھی ہے۔“

نوادین نے اس کا غرر جواب دیا۔ ”اجی نمبردارنی یہ مت کہو۔ دلی والے بھی مریں ہیں مریں۔ ڈاڈا کا ندھی اتنے دن سے واں پڑا تھا۔ لوگوں کی ٹھوڑی میں ہاتھ ڈال دیئے مگر کوئی مانا ہی نہیں۔“

نمبردارنی بے ساختہ بولیں۔ ”اے آندھی کا دھی۔ مٹا لولا پنکا۔ چاند گرہن کی پیدائش۔ وہ کیا ملاپ کرائے گا۔ اس نے تو حاک کی چیز تک پہنچا۔ وہ لیل بچائے کہ ساری دنیا ال گئی۔“

ہو سکے سینے میں ابھی اور زنجی پوشیدہ تھے اور بحث کسی اور طرف نکل جا رہی تھی نمبردارنی کی بات کانٹے ہوئے بولی۔ ”میرے تو من من کے ہوش اڑے جا رہے ہیں وہ کہہ رہے تھے کہ حسن پور میں بھی جو ہو جائے وہ تھوڑا ہے۔“

حسن پور کا ذکر آتے ہی ایک دم سے ساری بیبیوں کے چہروں کی کیفیت بدل گئی۔ بوجی کے دل میں نہ جانے کیسے کیسے خیال آ لے لگے۔ پھر بھی انہوں نے اپنی تسکین کا کچھ نہ کچھ انتظام کیا۔ ”بی بی جب غور پڑا تھا تو سارا ملک تر و ترہ بول گیا۔ مگر حسن پور کو اللہ نے اپنی مان میں رکھا۔ ہندو مسلمان یک ہو گئے یہ جو ہمارے سامنے والا پھیل ہے شیش اس پر ایک آدمی اڑھوں لے کے بیٹھ گیا تھا۔ جب گوجر چڑھ کے آئے تو اس نے اڑھوں بجا دیا۔ سب کے سب لٹھیں بلم لے کے نکل آئے۔ گوجر یہ دیکھ کے باہر سے باہر ہی چلے گئے۔“

فرحت کو یہاں پھر مجبوراً بولنا پڑا۔ یوحی یہ غدر نہیں ہے۔ یہ تو ہندو مسلمانوں کا فساد ہے۔“

ہو بولی۔ ”اتنی یوحی وہ تو کہہ رہے تھے کہ ولی کے بعد حسن پوری کا لبر ہے۔“

یہ فقرہ سن کر تو واقعی یوحی کے ہوش اڑ گئے مگر اس موقع پر افسری نے بڑا کام کیا۔ اب تک وہ بڑے صبر سے ہاتھ منتی رہی تھی لیکن اب اسے مجبور ہو کر یوحی کو یہ یاد دہانی کرانی ہی پڑی کہ مجلس اب شروع ہو جانی چاہیے۔ یوحی نے فوراً گلشن کو کھٹکھٹایا۔ گلشن نے جھٹ پٹ اپنے فرائض انجام دیئے۔ پھر انہوں نے بلو سے کہا کہ ”بی بی مجلس شروع کر دو۔“ اور بلوشہادت نامہ کھول کر بیٹھ گئی۔

نمبرداری روٹی کھتیں شور ریادہ بچاتی تھیں۔ لیکن یوحی شور نہیں مچا سکتی تھیں۔ وہ صرف روٹی تھیں اور بڑے خلوص اور یکسوئی سے روٹی تھیں اور آج تو ان پر کچھ بہت ہی زیادہ رقت طاری تھی۔ اور میں واقعات کر بلا کے ساتھ ساتھ ہو کی درد بھری آواز کو بھی بہت کچھ دخل تھا۔ پھر جب اس نے امام حسین کے بچپن کے واقعہ سے واقعہ کر بلا کی طرف گریز کیا تو اس کی آواز میں اور رقت پیدا ہو گئی۔ ”کیوں حضرات سنا آپ نے کہ جس کے رونے سے فرشتے ہائے آسمان گریاں ہوئے حیف صد حیف کہ اسی فرزند رسول کے ساتھ امت بے دین نے کیا کیا ظلم کئے۔ صحرائے کربلا میں پانی بند کیا اور تین روز کا بھوکا پیاسا زمین پر شل گوسفند قربانی کے ذبح کیا اور سر انور کو امام مظلوم کے ٹوک نیزہ طویل پر بلند کیا اور بستی بستی اور شہر شہر تشہیر کیا۔“

در بخت دریائے مجنح الحسن بن علیوں طیبہ کرب و بلا امام حسین

صاحب روضہ الشہداء نے لکھا ہے کہ امام ہمام جب بعد زوال زمین پر تشریف لائے تو شمر بنجربکف سینہ بے کینہ امام پر چڑھا اور اس بے ادبی کا مرتکب ہوا کہ زمین کر بلا لرز گئی۔ حمید کہ اس وقت میدان کربلا میں موجود تھا کہتا ہے کہ بعد شہادت زمین کو لرزہ آیا اور آسمان سے خون برسا اور ایک سیاہ آندھی اٹھی اور آفتاب کو گھٹن لگا اور منادی نے ندا کی کہ ”قتل الحسین مکر بلا ذبح الحسین مکر بد۔“ راویوں نے یوں بھی لکھا ہے کہ اس رات چاند کو گھٹن لگا۔ سارا چاند گھٹنا گیا اور رات بھر ایک بی بی کے نوحے کی آواز آتی رہی جو کبھی مشرق سے بلند ہوتی تھی اور کبھی مغرب سے آتی تھی اور کبھی ساری فضا میں پھیل جاتی تھی۔ ”نمبرداری روٹی بہت دیر سے رہی تھیں لیکن اب ان کے آنسو بھی نکلنے شروع ہو گئے تھے بلکہ اس وقت تو افسری کی آنکھیں بھی نم ہو چلی تھیں مگر شاید وہ رقیق القلبی کے کسی بڑے مظاہرے پر آمادہ نہ تھی۔ البتہ یوحی راد و قطار رو رہی تھیں۔ ان کے دوپٹے کا ایک کونہ آنسوؤں سے تر ہو گیا تھا اور ہلوا سی درد و سوز کے ساتھ پڑھے جا رہی تھی۔ منقوں ہے کہ اس رات مدینے میں درمیان زمین دآسمان رونے کی صدا اٹھیں سنی گئیں اور ایک فرشتہ ندا دیتا تھا کہ بخدا مسماہوئے ارکان دین کے اور تاریک ہوئے ستار ہائے عظم نبوت کے اور مٹ گئے۔ نشان پرہیز گاری کے۔ اے اہل

یہ شہر قابل بود و باش کے نہیں رہا۔ آگاہ ہو کہ شہر مدینہ کی رونق جاتی رہی اس لیے کہ حجازی کا مجاور اور تمہار سردار اور جنت کا شہزادہ اور ساقی کوثر کا نور عین تین دن کا بھوکا پیاسا کر بلا کی رہتی یہ ذبح کیا گیا۔ موشین ادھر تو یہ جاں تھا اور ادھر کر بلا میں ایک بی بی یوں لوح کر رہی تھی۔

دہرا کی عمر بھر کی کمائی کو کیا ہوا

بتلا دے اے زمین مرے بھائی کو کیا ہوا

نمبر دارنی کا گلہ اور نکھیں دونوں کام کر رہی تھیں۔ بوٹی کی روتے روتے پٹکی بندھ گئی تھی۔ نواہن بھی حسبِ مقدار رو رہی تھی۔ بلوکی آواز قسم گئی تھی اور رونے کا سلسلہ جاری تھا۔ آخر گلشن سے ضبط نہ ہو سکا اور اس نے اپنی نقل و حرکت سے گویا اس کا اعلان کیا کہ بس کرو۔ مجلس بہت دیر ہوئی ختم ہو چکی تھی لیکن مجلس کی فضا کچھ ایسی جی تھی کہ سنجیدگی کا ظلم نوٹے کو ہی نہ کہتا تھا۔ دیکھا تو یہ گیا ہے کہ کیسی ہی رقت کی مجلس ہو۔ ادھر مجلس ختم ہوئی ادھر باتوں کی گرما گرمی شروع ہوئی۔ دراصل مجلس کی ایک بڑی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ اس کی بدست مل بیٹھنے اور پنخارے دار باتیں کرنے کا موقعہ میسر آ جاتا ہے۔ اگر مجلسیں کہیں محض غم حسین تک محدود رہا کرتیں تو پھر مہم حسین کی شہادت سے بھی کڑی آزمائش بن جاتیں اور محرم میں جینا اجیرن ہو جاتا۔ لیکن یہ مجلس عجب تھی۔ حزن اور خاموشی نے ایسا جادو پھیلایا تھا کہ کسی کو بولنے بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ نمبر دارنی جب اچھی طرح آنسو پونچھ چکیں اور تبرک ان کی گود میں آ پڑا تو انہوں نے ایک دوہیم گرم فخر سے کہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نیم گرم مقررے مجلسِ حمید تھے مگر انہوں نے خاطر خواہ اثر نہیں کیا۔ نمبر دارنی کا حوصلہ ٹوٹ گیا اور انہوں نے دوبارہ اس قسم کے اقدام کی ہمت نہیں کی۔ البتہ گلشن کی بات کا ٹولس ضرور لیا گیا۔ لیکن اس سنجیدگی کی صفائی تو نہیں اور شدید ہو گئی۔ نمبر دارنی کو سوجھ بوجھ پر اسے شاید زیادہ اعتبار تھا۔ اسی لیے اس نے مخصوص طور پر نمبر دارنی کو مخاطب کیا۔ ”نمبر دارنی صاحب۔ سنیں ہیں کہ اس جمعرات کو چاند گرہن پڑے گا۔“

”چاند گرہن۔“ بوجی کے منہ سے صرف اسی قدر نکل سکا۔

سب بیبیاں خاموش تھیں۔

آخر نمبر دارنی بولیں۔ ”ری کون کہتا تھا؟“

”اجی دے رفیا کیوے تھا۔ کیوے تھا کہ آدھا چاند ڈوب جاوے گا۔“

”اللہ رحم کرے۔“ نواہن ڈرتے ڈرتے بولی۔ ”بڑا سخت گرہن ہے۔“

پھر خاموشی چھ گئی۔

نمبردارنی بو کے بڑھے ہوئے پیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔ "بی بی ذرا احتیاط رکھو۔"

بو چپ چاپ بیٹھی رہی۔

بو جی نہ معلوم کن خیالات میں گم تھیں۔ ایک انکی پولیس گویا خود اپنے آپ سے کہہ رہی ہیں۔ "لنڈن ہر بلا سے محفوظ رکھے۔ ہماری خاندانی کہا کرے تھیں کہ غدر کے دنوں میں ایسا کہن پڑا تھا کہ سارا چاند ڈوب گیا تھا۔"

خاموشی ور شدہ ہو گئی۔ نمبردارنی نے خواہ مخواہ چھ نیاں کترنی شروع کر دی تھیں سب خاموش تھیں۔ صرف سروٹے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ سب کے چہروں پر ایک سنجیدگی ایک ہر اس کی کیفیت طاری تھی۔ افسری چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے کی کیفیت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اس کی شرعی آنکھوں کی گھیرنا کسی فوری واقعہ کا اثر نہیں تھی۔ وہ تو ایک مستقل کیفیت تھی۔ شاید اس نے اس خبر کا اثر ایسی زیادہ شدت سے قبول بھی نہیں کیا تھا۔ ایک انکی وہ جاننے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ اس کے ٹھٹھے ہی دوسری دھپا۔ بھی اٹھ کھڑی ہو گئیں۔ بو جی نے چلتے چلتے افسری کو مخاطب کیا۔ "جی احتیاط رکھو ذرا خاندان ہر بلا سے بچائے رکھے۔ ہلکے میرے ہی گھر آ جائیے۔"

افسری نے بہت خاموشی سے یہ فقرہ سنا اور برقعہ کا کین اپنے گھر کی طرف ردائے ہو گئی۔

سبیلین کی مخالفت کے باوجود نماز پڑھنے اور کلمہ پڑھانے کے تحریک جاری ہی اور نماز پڑھنے اور کلمہ پڑھانے کی تحریک کے باوجود حسن پور میں خوف و ہراس پھیلا رہا۔ حسن پور کی آبادی کا طور یہ تھا کہ پورے محلے یا تو نرے ہندوؤں کے تھے یا نرے مسلمانوں کے تھے۔ حسن پور کی ناک ڈپٹی صاحب تھے اور ڈپٹی صاحب کا مکاں اوپر کوٹ میں تھا۔ ڈپٹی صاحب برسوں ہوئے اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ لیکن اوپر کوٹ کی دباک اب تک قائم تھی۔ آخر حسن پور والے کالے خاں کا لوہا بھی تو مانتے ہی تھے۔ پھر شیر و پھردار بھی کچھ نہ کچھ حیثیت ضرور رکھتا تھا۔ منٹو اخوندعلی کی دوکان پر آگے بیٹھتا تھا اور ڈپٹی صاحب مر گئے تھے تو کیا ہو تھا۔ مار رگھویر دیال بڑا اور دوسرے رئیس عید بقر عید پر تو سبیلین کے پاس آ ہی جاتے تھے۔ وضعداریاں تو اب چند مہینوں سے ختم ہوئی تھیں۔ اس کے بعد چکر ٹاگھو ما اور حق صاحب اور نمبردار صاحب نے ضرورت بے ضرورت مار رگھویر دیال بڑا کی دوکان پر پہنچ کر اپنی غیر فرقہ پرستانہ ذہنیت کا ڈھول پیٹنا شروع کیا۔ لیکن رفتہ رفتہ اصرار کم ہوا اور اوپر کوٹ ایک بند قلعہ بن کر رہ گیا۔ یوں حق صاحب اور نمبردار صاحب، مار رگھویر دیال کی زیارت سے محروم ہو گئے۔ سنتے ہیں کہ وقت بدلتے بدلتے بدلنا ہے۔ مگر حسن پور میں تو

وقت آنا نا بادل۔ ساری وصعداریاں یکا یک بالائے طاق رکھ دی گئیں۔ میل ملاپ ختم۔ لین دین بند۔ شہر اور نگر نے رروپا بندھا۔ مغربی پنجاب سے آنے والے شہر ترقی۔ حسن پور کے لیے دو حقے لائے تھے۔ نگر کا جذبہ اور انتقام کا جوش یہ دونوں چیزیں ساری فضا پر چھا گئیں، طبیعتوں میں رنج گئیں۔ پہلے ان کا خاموش مظاہرہ ہوا۔ اس خاموش مظاہرے کی ابتدا بالکل غیر محسوس طور پر ہوئی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس میں شدت پیدا ہوتی گئی۔ ساری فضا میں ایک انتھن کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ وقت کی رفتار بھی ہستہ ہوئی کبھی چیز۔ کبھی تو یوں معلوم ہوتا کہ حسن پور والے بکٹ گھوڑوں پر سوار ہیں اور یہ گھوڑے ایک اتھاہ کھائی میں اترے چلے جا رہے ہیں اور کبھی یوں محسوس ہوتا کہ وقت کا جوس ختم کیا ہے، جم کر کھڑا ہو گیا ہے۔ دنوں میں ایک سراسیمگی کی کیفیت ہوتی اور راتوں پر ایک سنگت طاری رہتا۔ رات شروع تو ہو جاتی تھی مگر ختم ہونے کا، نہیں لیتی تھی۔ بس یوں لگتا کہ تار کی فضا میں رس بس گئی ہے۔ وقت چلتے چلتے رک گیا ہے اور اب حسن پور میں دن کبھی نہیں نکلے گا۔ دن نکلنے کی ساری توقعات ختم ہو جاتیں اور نکل آتا مگر ہر قسم کے دھوم دھڑ کے بغیر۔ حسن پور کے باغوب کی چڑیاں آفر کہاں بھرت کر گئی تھیں اور کس احساس کے ماتحت بھرت کر گئی تھیں؟ کیا واقعی چڑیوں کا وجدان اتنا تیز ہوتا ہے کہ وہ فضا کو سونگھ کر آنے والے وقت کی بو باس معلوم کر لیتی ہیں؟ کچھ بھی بہر حال صحیح نہایت خاموشی سے نمودار ہوتی۔ کہیں بہت دور سے مرغ کی اذان تیرتی ہوئی آتی۔ پھر فضا کے سانے میں اذان کی کانپتی ہوئی آدیں بلند ہوتیں اور خاموشی میں ڈوب جاتیں دور کے کسی مندر سے گھنٹہ بجنے کے مسلسل آوازیں آتیں اور پھر خاموش ہو جاتیں۔ اجال ہوتا جاتا اور حسن پور کی خاموش گلیاں بدستور خاموش رہتیں۔ پھر دن نکل آتا اور بڑی آہستگی سے کسی کندھی کے کھلنے کی آواز آتی۔ اس کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے دروازہ کھلتا، اور گلیوں میں قدموں کی دبی دبی چاپ سنائی دیتی۔ دن چڑھنے لگتا، درون کے چڑھنے پر یہ راز کھلتا کہ دن نہیں نکلا ہے بلکہ رات ہی نے ایک نیا سوانگ رچا یا ہے۔ رات کا سوانگ جاری رہتا اور گلیوں اور سڑکوں پر باز روں اور منڈیوں میں خاک اڑتی رہتی۔ اکا دکا راگیر نظر آتا اور پھر نکاہوں سے وچھل ہو جاتا۔ گاہک چپ چاپ دوکانوں پر نمودار ہوتے آہستہ سے سودا مانگتے اور سودا سنبھال خاموشی سے واپس چلے جاتے گپ بازی کا دستور اٹھ گیا۔ دوکانوں کے پڑوں پر بیٹھنے اور فقرہ بازی کرنے کا روز ختم ہو گیا۔ قہقہے گایاں آوازے۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ بس ایک اضطراب کی کیفیت باقی رہ گئی۔ ہر بازار میں کھڑے ہو کر یہ گمان گزرتا کہ شہر میں کسی جنازے کا جلوس گشت کر رہا ہے۔ اور اب وہ ادھر سے گزرنے والا ہے۔ جنازے کا جلوس دن بھر گشت کرتا رہتا۔ پھر شام ہوتی۔ دنوں وقت رواروی میں بیٹھے اور جدا ہو جاتے۔ قدموں کی چاپ یکا یک تیز ہو جاتی۔ لوگ عجالت میں ہار روں سے ہونٹے اور گلیوں میں داخل ہونے لگتے۔ لوگ گلیوں میں داخل ہونے لگتے اور دروازوں کے دھاڑ دھاڑ بند

ہونے کی آوازیں آتیں۔ مکانوں کے دروازے بند ہوتے چلے جاتے اور رفتہ رفتہ رات کا سناٹا پھر پوری ہستی کو آدو چٹا۔

دن گزرتے گئے اور یہ غیر معمولی کیفیت معمول بن کر رہ گئی۔ ہر اس زندگی کا جز بن گیا۔ افسردگی فضا کی لس لس میں رقی گئی۔ مغربی عجاب سے شرابیوں کی آمد کا سناٹا بندھا رہا۔ پھر دلی کے فساد کی خبریں آتی شروع ہوئیں۔ یہ خبریں زیادہ ہونا ک زیادہ دہشت خیز ہوتی گئیں۔ فضا میں اینٹھن کی کیفیت اور زیادہ شدید ہو گئی اور بالآخر ایک روز مادہ پھٹ پڑا مچھٹنے کا وقت تھا۔ مسہر میں اڈاں ہو رہی تھی۔ اس وقت ایک سایہ ہلتا کانپتا اوپر کوٹ میں داخل ہوا۔ طس لائین جلا چکا تھا۔ آج اس کی دوکان پر غیر معمولی خاموشی ہوئی تھی۔ اکیڈا کالے خاں بیٹا اونگھ رہا تھا۔ اور تو اور رفیق بھی اس وقت موجود نہیں تھا۔ اسنے میں طس چوتک کر بول۔ ”بے یار کالے خاں دیکھو بے یار کون سا شرا بیوں کی طریوں سے جھومتا ہوا آیا ہے۔“

کالے خاں نے معلوم کس خیال میں گم تھا اور کس طرف اس کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔ بول۔ ”آنے دے ہے۔ ہوگا کوئی سا پلہ دار تازی بی کے آریا ہوگا۔“

اسنے میں سایہ لڑکھڑا کر نیچے گرا۔ طس اور کالے خاں دونوں ہلک کر پہنچے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ افسری کا شوہر رشید گرا پڑا ہے۔ پھٹا ہوا۔ کپڑے خون میں شر پور انہوں نے جلدی جلدی اٹھایا اور اسے گھر پہنچایا۔ رشید لب دم تھا۔ گھر پہنچتے ہی پٹ سے دم دے دیا۔ اوپر کوٹ میں خبر آگ کی طرح پھیلی۔ جس نے سنا پکا ہوا افسری کے گھر پہنچا۔ سارے محلہ میں تہلکہ پڑ گیا۔ جس مرد نے سنا اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جس عورت نے سنا اس نے سینے پر ہاتھ رکھا۔

دپر کوٹ پر بی کیا پورے حسن پور پر دو رات بہت سخت گزری۔ کالے خاں رہا اور علن کا گلیوں میں پہر لگا۔ انہوں نے رات میں کئی مرتبہ آگ بجھانے کے انجن کی آواز سنی۔ سبطین نے جو بھری بدوق کا ندھے پر رکھے رات بھر اپنے کونٹھے پر بیٹھا رہا تھا۔ بار بار مختلف محلوں سے آگ کے شعلے بلند ہوتے دیکھے۔

دلی

۷ مقبرہ

فضا کی اینٹھن ختم ہوئی۔ مگر عجب انداز سے۔ کوئی موبہوم ختم عجب انداز سے پچا ہونے کا بیانا نہ ٹول رہا تھا۔ فضا کو پچا ہونے کا بہا نہ مل ہی جاتا ہے۔ یہ دور اعصاب کی آزمائش کا دور ہے۔ خاموشی بھی اعصاب کو آزماتی ہے۔ ہنگامہ بھی اعصاب کو آزماتا ہے۔ وقت کا دستور یہ ہے کہ پہلے خاموشی چھا جاتی ہے اور اس خاموشی میں اتنی شدت اور ایسا ڈراؤنا پس ہوتا ہے کہ اعصاب جتنے گتے ہیں۔ دم گھٹنے

لگتا ہے۔ پھر اچانک خاموشی ٹوٹتی ہے اور اسکی قیامت افشتی ہے کہ کانوں کے پردے پھٹنے لگتے ہیں اور ذہن کی رکیں ٹوٹنے لگتی ہیں۔
۷ ستمبر

فساد شروع ہوا اور آگ کی طرح پھیل گیا۔ ہر محلہ پر یورش ہے اور ہر بستی پر حملہ کی تیاریاں ہیں۔ رات ایسا شور ہوا کہ خدا کی پناہ۔ یہ خوفناک شور خود آدمی کو پاگل کر دیے کو بہت کافی تھا۔ غارت خانوں کے دوزخ کے آواز یہ بھی رات بھر آتی رہیں۔ ان آوازوں کو سن کر یوں احساس ہوتا تھا کہ ساری دی شعلوں میں جھونک دی گئی ہے۔

اس فساد کی نوعیت میری سمجھ میں نہیں آتی۔ کبھی تو میں یہ سوچتا ہوں کہ یہ معمولی فساد ہے اور دو چار دن میں پوئیس اس پر قابو پالے گی۔ مگر بار بار میرا دل ایک نامعلوم خوف سے دھڑکے لگتا ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ کوئی معمولی فساد نہیں ہے۔ یہ کوئی بڑی قیامت ہے۔ ۵ کی قیامت سے بڑی قیامت۔

۸ ستمبر

سارے محلہ میں خوف و ہراس پھیل ہوا ہے ہر چہرے پر ہوائیاں اڑتی نظر آتی ہیں جو خبریں یہاں پہنچ رہی ہیں وہ واقعی بڑی خوفناک ہیں۔ ان کا شہکی ہونا چاہیے جو ہو رہا ہے مگر میں حیران ہوں کہ اس زمانے میں جب یہاں مذکور کوئی آتا ہے نہ یہاں سے کوئی جاتا ہے۔ یہ ہل ہل کی خبریں یہاں کیسے پہنچتی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں انہیں خبریں ہی کہوں یا افواہیں کہوں۔ ممکن ہے ان کی اصیت کچھ نہ ہو۔ محض خوفزدہ فحشیل کی ایجادیں ہوں۔ مگر اس زمانے میں واقعہ اور افواہ میں امتیاز کرنا بھی کچھ بے معنی ہی سی بات ہے۔ معمولات کی دنیا میں افواہیں بڑی مبالغہ آیز ہوتی ہیں لیکن جب معمولات کا طام درہم برہم ہو جائے تو واقعات اتنے مبالغہ آیز دیکھنے پر رونا ہوتے ہیں کہ فریب افواہوں کی ان کے سامنے کوئی بساط ہی نہیں رہتی یہ زمانہ وہ ہے کہ حقیقتیں افواہیں بن گئی ہیں اور افواہیں حقیقتیں۔ ایک خوفناک واقعہ ہوتا ہے اور اس کی خبر دم کے دم میں یوں پھیلتی ہے گویا یہ کوئی افواہی جیسے پھیلنے کے لیے کسی شخص مادی زریعہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دلی شہر بہت سی الگ الگ دنیاؤں میں بٹ گیا ہے۔ ہر محلہ ایک الگ دنیا ہے جس کا باقی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں ہے مگر شہر کے کونے میں بھی جو کوئی واردات ہوتی ہے اور فضا کی لہریں اسے سارے شہر میں پھیلا دیتی ہیں۔

۹ ستمبر کی رات

دن کے متعلق آخر کیا لکھوں۔ دن ہے کہاں۔ دلی میں جب دن نکلے گا دیکھا جائے گا اب تو رات کا تسلط ہے۔ ایک خوفناک ہنگامہ خیز رات ہے۔ جس نے پوری دلی کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ رات محلہ کے ہر شخص کو یقین تھا کہ حملہ ہوگا۔ مگر حملہ نہیں ہوا۔

قیمت سر پر آ کر ٹل جاتی ہے یہ تذبذب کی کیفیت سخت اذیت ناک ہے۔ قیامت کو اگر ٹوٹا ہی ہے تو ٹوٹ کیوں نہیں پڑتی۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے کہ مجرم کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دیا اور جلا دکھیں کہ ہم حق پی کراتے ہیں۔ پھر تجھے پھانسی لگا میں گے۔ یہ پورا معاملہ پھانسی کے تختے پر کھڑا ہے۔ پھانسی کا چندا سر پر لٹک رہا ہے گلے میں نہیں آتا۔ لوگ اسے قیمت سمجھتے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ پھانسی تکلیف دہ نہیں ہوتی۔ پھانسی لگنے کا احساس تکلیف دہ ہوتا ہے

۱۰۔ اکتبر

پارے محلہ میں ایک سرائیکی ورہ جو اس کی کیفیت عاری ہے۔ ہر شخص ڈرا ہوا ہے پریشاں دماغ خوفناک سے خوفناک تصویر بناتے ہیں اور پھر اس سے مطمئن نہ ہو کر اسے مٹا ڈالتے ہیں۔ وہ کچھ زیادہ خوفناک تصویر بنانا چاہتے ہیں۔ ہر شخص اس لگڑ میں ہے کہ یہاں سے نکل کر کسی محفوظ مقام پر پہنچ جائے۔ مگر یہاں سے نکل کون سکتا ہے۔ ہم ایک نلکہ میں محصور ہیں، یہاں نلکہ جس کی ہر دیوار بوہی ہے۔

خوف و ہراس اس کی کیفیت ہر چہرے پر نظر آتی ہے۔ مگر شاید یہ خوف کی انتہا نہیں ہے۔ خوف کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ آدمی بے خوف ہو جاتا ہے۔ مجھے خوف ہر جگہ نظر آتا ہے۔ خوف کی انتہا کہیں نظر نہیں آتی۔

۱۱۔ اکتبر

آج میں نے ایک ایسے شخص کو دیکھا جس کے چہرے پر خوف کی کوئی علامت نہیں تھی۔ ہاں اس کے چہرے پر ایک خوفناک ارادے کی جھلک تھی۔ جسے دیکھ کر میں ایک مبہم خوف سے کانپ اٹھا۔ اپنے سامنے والے ہواڑی کی دوکان پر میں نے اس شخص کو دیکھا۔ وہ بہت دیر تک گم سم بیٹھا بیڑی بیٹھا رہا۔ اس کی نگاہیں غلامیں کسی چہرے کو گھور رہی تھیں۔ اس نگاہوں میں ایک ایسی خوفناک کیفیت تھی کہ انہیں دیکھ کر خواہ مخواہ وحشت ہوتی تھی۔ پھر وہ ایک ایسی ہواڑی سے مخاطب ہوا۔ ”بیویوں کو محمد کیوں نہیں ہوتا؟“ ہواڑی نے نہ جانے کیا جواب دیا۔ اس نے اتنی آہستہ سے جواب دیا کہ میں سن نہ سکا میں نے بس یہ دیکھا کہ اس شخص نے اس جواب سے کوئی اثر نہیں پایا اور پھر اسی طرح غلامیں گھورنے لگا۔ بیڑی ختم کر چکنے کے بعد یہ شخص چپ چاپ اٹھا اور سامنے والی گلی میں مڑ گیا۔ اس کی چال و حال میں کچھ ایسی بے جگری کی کیفیت تھی جسے میں محسوس تو بہت شدت سے کر رہا ہوں مگر میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔

اس شخص کا ہواڑی نے نام بھی لیا تھا۔ شیر خاں شیرا شیر و نہ جانے کیا نام لیا تھا۔ بہر حال شیر پر کچھ نام ہے۔ مجھے دھیمان پڑتا ہے

کہ یہ نام میں نے کہیں سنا ہے۔ یہ شکل بھی مجھے دیکھی بھالی سی معلوم ہوتی ہے۔ مگر مجھے یاد نہیں آتا کہ میں نے اسے کہاں دیکھا تھا۔ میں اتنے شہروں میں گھوم چکا ہوں اور اتنے لوگوں کو میں نے دیکھا بھالا ہے کہ اب کسی شکل میرے ذہن میں وضع نہیں رہی ہے۔ دھندلی شکلوں کا ایک جلوس ہے جو میرے تصور میں چکر کاٹتا رہتا ہے۔ اس مختصر سی آوارہ زندگی میں میں نے بھی کس کس قماش اور کس کس رنگ کا آدمی دیکھا ہے۔

۱۲ تبصر

تذبذب کے لمحات طویل ہوتے چلے جا رہے ہیں اس تشنج کی کیفیت سے مجھے ہنگامہ یاد دہند ہے۔ ساری دلی میں ہنگامہ برپا ہے۔ ہنگامہ برپا نہیں ہوتا تو یہاں برپا نہیں ہوتا۔ اب تو یہ کیفیت ناقابل برداشت ہو چلی ہے۔ میرے ذہن کی رگیں ٹوٹی جا رہی ہیں۔ بس یوں ہی چاہتا ہے کہ کپڑے پھاڑ کر گھر سے نکل جاؤں اور کسی ایسی سڑک پر پہنچوں جہاں ہر طرف خون ہو، شیش ہو اور چٹا پکار ہو۔ "خبر میں چٹائی کے تختے پر کب تک کھڑا ہوں کیوں نہ میں خود ہی پھندے کو کھینچ کر گٹھے میں پھنسا لوں۔"

۱۳ تبصر

آج کوئی نئی تاریخ نہیں ہے۔ وہی کل کی تاریخ ادھ سوئی حالت میں رنگ رہی ہے بلکہ رہی ہے اور اگر واقعی آج کوئی نئی تاریخ ہے تو میں سے کل کی تاریخ سے تیز نہیں کر سکتا۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ آج دن ہی نہیں اٹکا۔ ہذا نئی تاریخ کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ رات جو کیفیت تھی وہ بھی جا رہی ہے اس کیفیت کو میں کیسے بیان کروں۔ بھلا اتنی شدید کیفیتیں لفاظ میں کیسے بیان ہو سکتی ہیں۔ زبان تو کام چلاؤ چیز ہے۔ یہی شدید کیفیتیں ظاہری کب ہوتی ہیں جو ان کے اظہار کی ضرورت پیش آئے۔ بس یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہنگامہ اور شور کا ایک شیداب ہے جو فضا میں بند ہوتا چلا جا رہا ہے اور جو پوری دلی کو اپنی رو میں بہا کرے جائے گا۔ کبھی کبھی یوں بھی ہو کہ فضا میں ایک سناٹا طاری ہو گیا۔ مگر یہ سناٹا اس شور سے بھی زیادہ خوفناک تھا۔

فضا کی کیفیت اب بھی وہی ہے جو رات تھی۔ بس اتنا فرق ہے کہ رات آگ کے شعلوں نے فضا کو روشن رکھا تھا اور اب سورج کی ٹلگنی روشنی دیواروں اور میدانوں پر پڑ رہی ہے۔

۱۴ تبصر

معلوم نہیں آج کی تاریخ کلکٹر میں کس طرح نکلی ہوئی ہے۔ مگر مجھے وہ چمکاؤ کی طرح اسی لٹکی نظر آتی ہے۔ شاید آج وقت ہی اٹنا لٹک گیا ہے۔ میں رات بھر جاگا اور دن بھر سویا۔ دن ابراؤد تھا۔ رات چلتے ہوئے مکانوں نے فضا میں ہر طرف روشنی کر رکھی تھی

جس شخص کو میں نے دیکھا وہ ہونق بنا ہوا تھا پریشان اور سر اسیر تھا۔ مگر محلہ کے اکثر کتوں کو میں نے دیکھا کہ وہ اطمینان سے چلتے پھرتے ہیں۔ محلہ سے باہر جاتے ہیں اور گھوم پھر کر واپس آتے ہیں اور بیچ سڑک پہ آرام کرنے لگتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے دنیا کا نظام الٹا ہو گیا ہے۔

۹ ستمبر

مجھے یاد نہیں آتا کہ آج کیا ہے یا تو آج کوئی تاریخ ہے ہی نہیں ہے اور اگر ہے تو وہ اتنی زبردست تاریخ ہے کہ میں اسے بیان کرنے کی سکت نہیں رکھتا۔ اس وقت میں جہاں ہوں لوگ اسے پرانا قلعہ بتاتے ہیں۔ میں یہاں کب آیا اور کیسے آیا اس کا مجھے مطلق پتہ نہیں ہے۔ میرا ذہن اس وقت کچھ ٹھیک کام نہیں کرتا۔ مجھے کوئی بات یاد نہیں ہے میرے حافظہ میں بس کچھ اُٹل بے جوڑ تصویریں منظر رہی ہیں۔ میں ان میں ربط پیدا نہیں کر سکتا۔ یہ سب دھندلی اور غیر واضح تصویریں ہیں۔ روشن تصویر تو بس اس شخص کی ہے جس کا دماغ خراب ہو گیا تھا اور جو مسلسل دو دن تک مٹھین گن چلا تا رہا۔ یہ وہی شخص ہے شیر خاں شیر آشیرو۔ جو بھی اس کا نام ہو۔ وہ تو نام سے، اور ایک شخصیت تھا۔ اس کا دماغ خراب ہو جاتا۔ یہاں پرانے قلعہ میں ہر طرف آدمی ہی آدمی دکھائی دیتا ہے۔ یہ مجب کرشمہ ہے کہ ن میں سے کسی کا بھی دماغ خراب نہیں ہوا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے اپنی بصارت پر شبہ گزرنے لگتا ہے۔ کسی پاس سے گزرتے ہوئے آدمی کو میں چھو کر دیکھتا ہوں۔ وہ واقعی آدمی ہی ہوتا ہے اور پھر بھی اس کا دماغ چلا ہوا نہیں ہوتا۔ لیکن اس شخص کا دماغ چل گیا تھا۔ وہ پاگل ہو گیا تھا۔ مجھے اتنا بھی طرح یاد ہے کہ وہ سامنے والے مکان کی چھت پر کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی۔ اس کے چہرے کے خطوط سخت پڑ گئے تھے۔ اس کے پورے جسم پر ایک خشونت طاری تھی۔ وہ بالکل گم سم ہو گیا تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے ٹھیک کر رہا ہے یا غلط کر رہا ہے۔ صبح اور غلط کے متعلق شاید خود اس نے بھی نہیں سوچا تھا۔ شاید وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے جو کچھ وہ کر رہا تھا وہ کر رہا تھا۔ باقی لوگ آنکھیں پونڈ پونڈ کر دیکھ رہے تھے۔ ان کے حواس معطل ہو گئے تھے۔ محلہ کے چاروں طرف ایک شور برپا تھا۔ مسلسل شور اور مسلسل آگ۔ مکانوں میں آگ لگ رہی تھی۔ گولیاں دھواں دھواں چل رہی تھیں۔ لوگ بدحواسی کے عالم میں بھاگ رہے تھے اور وہ شخص اسی طرح گم سم وحشت زدہ کیفیت میں کھڑا تھا اور اپنا کام کئے جا رہا تھا۔ آگ کے شعلوں دھواں گولیوں اور چیخ و پکار کی اس رسائی میں وہ شخص کہاں گیا۔ وہ گولی کا نشانہ بن گیا یا جل کر مر گیا یا زمین میں سما گیا یہ مجھے خبر نہیں۔ مگر میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ اب زندہ نہیں ہے۔

۱۸ ستمبر

میرے حواس اب تک اعتدال پر نہیں آئے ہیں۔ اس وقت میرا سر گھوم رہا ہے میری آنکھوں سے گری نکل رہی ہے نہ جانے میں کب سے نہیں سویا۔ جب بھی میری ذرا آنکھ لگتی ہے شیر خاں کا گم سم و حشت زدہ چہرہ میرے سامنے آ جاتا ہے۔ تڑا تڑا گویاں چلنے لگتی ہیں اور دھوئیں شعلوں چیتوں اور نعروں کا ایک قلو طوفان امڈنے لگتا ہے۔ میری آنکھ کھل جاتی ہے یہ گم سم چہرہ میرے تصور میں بس گیا ہے میرے ذہن پر مسلط ہو گیا ہے۔

۱۹ ستمبر

شیر خاں کون تھا؟ وہ زندہ ہے یا مر گیا؟ یہ سوالات آج دن بھر میرے ذہن میں چکر کاٹتے رہے ہیں۔ میں نے آج محلہ کے کئی آدمیوں سے اس کے متعلق پوچھا۔ وہ اتنا بتاتے ہیں کہ وہ شخص محلہ میں نیا آیا تھا۔ اس کا نام شیر خاں نہیں شیرو تھا۔ سب کہتے ہیں کہ وہ مر گیا۔ کیسے مرا یہ کسی کو پتہ نہیں۔ مجھے یہ نام بھی سنا ہوا سا معلوم دیتا ہے اور یہ چہرہ بھی دیکھ بھرا سا لگتا ہے مگر میں نے اسے آخر کہاں دیکھا تھا۔ شاید میں نے اسے کہیں نہ دیکھا ہو۔ یہ محض میرا خیال ہو۔ ممکن ہے شیرو خود کوئی شخص نہ ہو۔ محض ایک خیال ہو ایک تصور ہو۔ وہ تصور چاہی تو م کی برہادی کے ہر سوتلہ پر اپنی ایک جھلک دکھاتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے۔ وہ تصور جو کبھی نیپو کے غفار کا بھیس بدلتا ہے اور کبھی بہادر شاہ ظفر کے کالے خاں گولندار کے دیکر میں غلہ ہوتا ہے۔

شیرو کے خوفناک حیدر اس کا گم سم چہرہ بار بار میری نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ کبھی کبھی وہ پورا منظر اپنی شکل بدلنے لگتا ہے وہ مچھت، ل قلعہ کی فصیل بن جاتی ہے اور شیرو مجھے کالے خاں گولندار نظر آنے لگتا ہے۔ پھر کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ غفار ہے جو ایک ایسے قلعہ کی فصیل پر کھڑا ہے جس کے اندر کوئی نیپو نہیں ہے۔

کبھی کبھی تو میرے دوس میں یہ خواہش کروٹ لیٹے لگتی ہے کہ اس المیہ کا کالے خاں گولندار اس شخص کی بجائے میں ہوتا۔

۲۰ ستمبر

پرانے قلعہ میں پناہ گزینوں کا تانا بانا ہوا ہے۔ محلے اجڑ رہے ہیں اور لوگ یہاں آ رہے ہیں۔ مختلف محلوں سے لوگ سمن کر پرانے قلعہ میں آتے ہیں۔ پرانے قلعہ سے انشیش جینچے ہیں۔ انوشل بھرتی ہے اور پاکستان روانہ ہو جاتی ہے۔ گاڑیوں پر محلوں کی خبریں روز بچتی ہیں اور پھر بھی لوگوں کا ذوق و شوق کم نہیں ہوتا۔ دلی والے دلی چھوڑ کر یوں بھاگ رہے ہیں جیسے نیل رسہ تڑا کر بھگتا

۴

۲۱ ستمبر

دشمنی میں قحط پڑ رہا ہے مگر یہاں نے عشق کو فراموش نہیں کیا ہے۔ بلکہ شاید قحط کے ساتھ ساتھ اس کی رفتار بھی تیز ہو گئی ہے جو بھی گل پہ پانی سے گریو وہ پیہر ہو کر پلانا جوڑ کی کسی دوسرے خمیے کی طرف نکل گئی وہ ایک چوٹ سولے کروا پس آئی۔ پرالے قلعہ میں دن بھر نکاح ہوتے ہیں۔ وہ ہا لہن خود ہی راضی ہو جاتے ہیں۔ قاضی غریب تو مفت میں جناح ہو رہا ہے۔ خانہاں برباد پناہ گزینوں کے ہاتھ یہ اچھا مشغلہ ہے۔ بیٹھے سے دیکھا رہی کا مضمون ہو رہا ہے۔

۲۲ ستمبر

ہاں آخر رخصت کی گھڑی آ پہنچی۔ اس عجیب و غریب شہر سے آج میں رخصت ہو رہا ہوں۔ یہاں میں آیا بھی محب انداز سے دور جا بھی رہا ہوں محب انداز سے۔ میں نے مسلمانوں کے بہت سے شہر دیکھے بہت سی بستیوں کی سیر کی۔ مگر اس بستی کا سہر سب سے انوکھا رہا۔ اس شہر کے درو دیوار جن سے کل تک وحشت برستی تھی۔ آج چپ چاپ حسرت کی تصویر بنے کھڑے ہیں۔ یہ لال قلعہ یہ قلعہ مینا زہیہ جامع مسجد یہ مسلمانوں کی تاریخ کے گنگ لٹھے۔ یہ پر سور محمد مرچے۔ چند گھنٹوں کے اندر اندر میری نگاہوں سے اوچھل ہو جائیں گے۔ یہ پوری بستی نگاہوں سے چھپ جائے گی تار کی میں ڈوب جائے گی اور میں بچنے نئے وطن کی طرف جا رہا ہوں گا۔ شہر سے جو سیاہ سایہ دار سڑک اسٹیشن کو جاتی ہے اسے دیکھ کر آج کچھ ایسا گمان گزرتا تھا کہ کوئی بڑا میلہ ڈال رہا ہے۔ اس سڑک نے گنگا کے میلے کھڑا ہتے دیکھے تھے۔ لوگ منہ اندھیرے اٹھتے اور اکوں تانگوں میں بیٹھ بیٹھ کر اسٹیشن کی راہ لیتے۔ جنہیں سواری نہ ملتی وہ پیدل ہی چل پڑتے اور جیتے بولتے منزل پر پہنچ جاتے۔ اس سڑک سے بہت کر جو ایک کچی سڑک ریل کی پٹری کو پار کرتی ہوئی چلی گئی ہے۔ اس پر تیل گاڑیوں کا ایسا تاننا بندھتا تھا کہ نوٹے میں نہ آتا تھا۔ دیہاتیوں کی ایک ٹولی آواز میں آواز کا گیت گانا شروع کر دیتی اور پھر خاموش ہو جاتی۔ چند گھنٹوں تک خاموش رہتی اور پھر دوسری ٹولی گیت شروع کر دیتی۔ گیتوں کا یہ سلسلہ رات رات بھر اور دن دن بھر جاری رہتا۔ دن کے چنگا سے تو ان گیتوں کو کہاں ابھرنے دیتے تھے مگر وہاں دنوں کی راتوں میں وہ اپنی پوری کیفیت بن چکاتے مگر یہ خاموش سہا ہوا امید اس ڈر سے کانپ رہا تھا کہ کہیں رات اس کے قدموں کی چاپ نہ سن لے۔ معلوم نہیں رات کو کونسی گھڑی میں یہ میدان ہلنا شروع ہوا تھا لیکن جب اجالا ہوا تو سڑک پر دور تک اکوں تانگوں رکت وں کی ایک مین ڈوری نظر آئی۔ ایک بڑا جھوم ایسا بھی تھا جس نے پیدل ہی اسٹیشن پہنچنے کی غنائی تھی۔ خاک آلود چہرے بھنی بھنی آنکھیں چٹکے ہوئے ہاں مضطرب جسم جسم جو سن ہو چکے تھے۔ جسم جو خود بخود حرکت کر رہے تھے۔ حسن پور کی فضا نے ایسا میدان ملنے ہوئے کبھی کا ہے کو دیکھا ہوگا۔

اسٹیشن آدمیوں سے پٹا پڑ تھا۔ چاروں طرف سامان کے ارنگ کے اڑنگ لگے ہوئے تھے۔ بنگ آفس کے سامنے ایک میدان

لگا تھا۔ ٹکٹ کی کھڑکی پہ وہ دھکا تلک تھی کہ خدا کی پناہ۔ سپرے کے سپاہی کی جب ساری گایاں بے اثر ثابت ہوئیں تو انسپکٹر پولیس ہنٹرے کر باہر نکلا۔ بھیڑ چھٹ گئی۔ مگر صرف تھوڑی دیر کے لیے۔ چند منٹ بعد پھر آدی پہ آدی کرنے لگا۔ البتہ وہ سفید و زخمی والے بزرگ جن کے رخسار پہ ہنسر پڑا تھا پھر نظر نہیں آئے۔ ہجوم میں ہر قماش اور ہر صلیب کا آدی موجود تھا۔ ایسے لوگ بھی تھے جو دھیرے سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور اپنے وجود کو بچا لانے کو ایک کارنامہ قرار دے رہے تھے ایسے لوگ بھی تھے جو گھروں میں بھاڑ دے کر آئے تھے اور ہاتھ مل رہے تھے کہ وہ اپنے بھرے گھر چھوڑ آئے۔ بعض لوگوں کو اپنا وجود بھی بارگزر رہا تھا اور بعض لوگ ہاں بچوں کے ساتھ ساتھ کبوتروں سے بھری ہوئی کابکس اور نوپوں میں بند مرغیاں بھی همراه لائے تھے۔ بعض قلندر مزاج سارے گھر بار پہ رات مار کبوتروں کی کابکس سر پر رکھ سٹیشن آ پہنچے تھے۔ بوغریب پیٹ سے تھی۔ اپنا آ پاسنبالٹی یا سامان باندھتی۔ اس کے ہاتھ میں بس ایک پٹائی تھی۔ بیتہ میدا اکیہ نے ضروری چیزوں سے زنک بھر لیا تھا۔ نو این صرف ایک گھڑی بغل میں، رانی تھی۔ ہاتھ میں طوطے کا بچرا تھا۔ حق صاحب چار زنک، ایک سوٹ کپس اور ایک بستر بھرا لائیکے۔ انہیں اس موقع پر اہلیہ مرحوم روہ کر یاد آئیں۔ وہ ہوتیں تو ہوتھوڑا بہت سامان اور ساتھ لے آتے۔ نمبر دار نے مٹی اور نقدی اور یور تینوں چیزوں کو بند ریوہوائی جہاز ل اور بھیجنے کا تہیہ کیا تھا۔ اس سے مٹی کی عصمت کی حفاظت کے سوا اور کچھ مقصود نہ تھا۔ لیکن اس کو کیا کہ جائے کہ دل کے فب دی وجہ سے ہوائی جہاز پر پہنچنے کا رستہ ہی بند ہو گیا۔ اور اب نمبر دارنی کو گھر کے دوسرے سامان سے پہلے نقدی اور گھنے پاتے کے صندوق اور فرحت کی فکر کرنی پڑی۔ انہوں نے یہ غلطی کی تھی کہ موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے دوسرے سامان کے ساتھ ساتھ چار پائیوں کو کھوں کرن کے پائے پیرا بھی ایک جگہ باندھ لی تھیں۔ مگر بنگ آفس والا سخت متعصب نکلا۔ اس نے پائے غلوں کو بک کر نئے سے صاف الکار کر دیا۔ افسری بوجی کے بر پر کھڑی تھی۔ اس کی وہ حکمت بدستور قائم تھی۔ ہاں اس کی شرعی آنکھیں اب کچھ اور زیادہ گھبر اور کچھ اور زیادہ افسردہ نظر آتی تھیں۔ بوجی کب تک کھڑی رہتیں صندوق پر بیٹھ گئیں۔ انہوں سے گھر سے کبھی کا ہے کو قدم نکالا تھا۔ زندگی میں ایک مرتبہ ضرور انہوں نے ایک عزیر کی موت میں شرکت کی غرض سے سفر کی نیت باندھی تھی۔ لیکن ابھی اسٹیشن نہ پہنچنے پائی تھیں کہ ٹیل کھنڈہ رستہ کاٹ گیا۔ فوراً اک واپس کروایا اور اس کے بعد پھر کبھی سڑک کا ارادہ نہیں کیا۔ لیکن آج وہ ہر قسم کے شگون اور بد شگون کو بھول کر بیٹے کے ساتھ گھر سے نکل پڑی تھیں اور پنا خود یہ نہیں جانتا تھا کہ آخر وہ گھر سے کیوں نکل پڑا ہے۔ نمبر دار صاحب اور حق صاحب نے تو فساد ہوتے ہی ہجرت کی تجویز پیش کر دی تھی۔ مگر وہ ایسا از ان کی بات چلنے ہی نہ پائی، لیکن آج ان کی بات خود بخود چل گئی تھی۔ وہ اسٹیشن پر حیران و پریشان کھڑا تھا۔ وہ شخص جس نے اپنی ایک عمر مسلمانوں کے زوال کے اسباب سمجھنے اور ان کی

توجیہات کرنے میں صرف کی تھی۔ آن حسن پور کے اسٹیشن پر مجسم سوال بنا کھڑا تھا اس کی سمجھ میں خاک نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ سبطین حیران تھا اور کالے خاں اور علین اور رفیق بھی حیران تھے۔ بوجی بھی حیران تھیں۔ در اگر حسن پور کے درود یوار میں حیران ہونے کی صلاحیت ہوتی تو وہ بھی ضرور حیران ہوتے کہ حسن پور کے یہ بیرواؤ پر کوٹ کے یہ ڈھ آ خر کیوں جا رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔ حسن پور کے درود یوار حیران نہ ہوئے ہوں مگر علین کی دوکان کی خستہ دیواریں ضرور حیران ہوئی ہوں گی۔ سب اپنا اپنا سامان لے کر اٹھے تھے۔ کوئی تھوڑا سا سامان لے کر نکلا تھا۔ کوئی بہت سا سامان لے کر نکلا تھا۔ لیکن علین کو کون سا سامان لے کر نکلتا۔ اس کی دوکان میں رکھا ہی کیا تھا۔ یہی سڑی بسی گزدہانیاں اور ریوڑیاں اور نوٹی پھوٹی چلیں۔ اس کی دوست دوکان کی چیریں نہیں خود دوکان تھی دوکان کو وہ کیونکر لے آتا۔ اور اب دوکان باقی کہاں تھی۔ وہ تو شاہ بہرام کی سبز پری۔ لعل شہر کے بادشاہ نے سبز پری کی سرائے کے گرد حلقہ ڈال دیا اور سبز پری بوٹ پات کر کیو تری بنی اور ازگنی۔ سبز پری ازگنی کھو گئی در شاہ بہرام سردھنٹا رہ گیا۔ شاہ بہرام کی قسمت میں آو رگی کبھی تھی۔ شاہ بہرام آوارہ ہو گیا۔

گلٹ کی خریداری جوئے شیر لانے سے کچھ کم نہ تھی۔ اسباب بک کرانا خود ایک مسئلہ تھا۔ پھر گلیٹ پر ہو بھیج تھی کہ اس کو دیکھ کر مجھے چھوٹ کا پتہ پانی ہوتا تھا۔ غرض پیٹ فارم تک پہنچنا ہفت خواں کا معرکہ بن گیا لیکن طے کرنے والوں نے مفتواں کی ساری منزلیں طے کیں اور جب اسٹیشن پر پہنچی تو اس میں آدمی خاصا فس بھرے ہوئے تھے۔ دراصل وہ تو دلی کے اسٹیشن پہنچی پر ہو چکی تھی۔ سب تو اس میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی لیکن جہاں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ وہاں حسن پور کا ایک قافلہ کا قافلہ اور سا گیا۔ آدمی جب پھیلتا ہے تو وسیع و عریض زمین بھی تنگ ہونے لگتی ہے اور جب سکڑتا ہے تو تل بن جاتا ہے اس لدی پھندی گاڑی میں اور مسافر کیسے سائے۔ بات تعجب خیز سی مگر ہے واقعہ ہی۔ جو شخص جس ڈبے میں ٹکس سٹاکس کیا اور کھستے ہی ڈبے کا محافظ بن گیا اس قسم کے خود ساختہ محافظ ہر ڈبے کے دروازے پہ ڈانے کھڑے تھے۔ پلیٹ فارم پہ ٹاک نوٹیاں مارنے والوں کی یہ متفقہ رائے تھی کہ یہ لوگ اسلامی احساس سے عاری ہیں۔ ان ٹاک نوٹیاں مارنے والوں میں سے جو شخص خوشامد در آمد سے یا دھینگا مشتی سے اندر پہنچ گیا۔ ایک تخت ان کی صف میں شامل ہو گیا۔ ہر طرف نفہ نفسی پڑی تھی۔ دوسروں کی کسے خبر ہوتی۔ لوگوں کو خود پتا ہوش نہ تھا۔ ہر شخص گاڑی میں داخل ہونے کے لیے باؤں ہو رہا تھا۔ جو اندر داخل ہو گیا۔ اسے جنت کا پروانہ مل گیا جو رہ گیا اس کے لیے دنیا اندھیر ہو گئی۔ ایسے میں سبطین کی کیا چلتی اور بوجی غریب تو بچس کے آتا ہو جاتیں۔ مگر قسمت کی کار ساری دیکھئے کہ ایک ڈبے میں فیاض خاں بیٹھا نظر آ گیا۔ اس نے سبطین ہی کو نہیں اوپر کوٹ کے اور بہت سے لوگوں کو بھی اپنے ڈبے میں کھسک لیا۔ بوجی گاڑی میں بھلا کب سوار ہوئی

تھیں اور اس پر یہ دھکا کھیل اور سسٹم کشتا۔ پاؤں رکھتی کہیں تھیں۔ اور پڑتا کہیں تھا۔ اندر داخل ہو گئیں تو ایک دلی والی نے دھکا دیا۔
 "اوکی میرے پاؤں کا پکلا ہو گیا۔ سے بی آپ کو تو نجاتی ہے کیا؟"

بوجی نے فوراً معذرت کی۔ "بی بی معاف کر دو۔ میں نے دیکھا نہیں تھا۔"
 دلی والی چپ تو ہو گئی مگر جب جگہ دینے کا سوال آیا تو پھر بھڑک اٹھی۔ "اے واہ تم بڑی آئیں کہیں کی۔ میں خود پھنسی بیٹھی ہوں۔
 دی سے بس بوٹنی چلی رہی ہوں۔ گھوڑا پاؤں بھی تو ایک جگہ رکھے رکھے بن ہو گیا۔"

جیسے جیسے کر کے بوجی کو پیٹھے کی جگہ ملی۔ اتنے میں نوابین نے شور مچا شروع کر دیا۔ "اے بے میرے طوطے کا بھجرا رہ گیا۔
 اے بھیا کوئی اٹھ دو" اور جب کسی نے اس شور پر دھیان نہ دیا تو اس نے جیترا بدلا۔ "اے تو پہ تو بہ۔ کبھت کیسے آدی ہیں۔ ایسی بھی
 آپا دھالی کیا۔ بھجرا اٹھانے سے گھوڑے ہاتھ تو نہ ٹوٹ جاویں گے۔"

آخر کالے خاب کی غیرت نے جوش مارا۔ کودتا پھاندا وہ کھڑکی سے باہر پہنچا اور بھجرا لاکھڑا کر نوابین کے حوالے کیا۔ بوجی کو اب تک تو
 تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ لیکن بیٹھتے ہی انہوں نے ہوشمندی دکھائی اور اپنے اسباب کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ سبطین کو دیکھ کر ان کا
 سانس میں سانس آیا۔ گلشن تو خیر بر بری بستر پہ ڈنی بیٹھی تھی۔ آس پاس کے تلفظ چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے وہ پکا یک چوٹ گئیں۔
 "اے سبطین۔ رافیا کہاں گیا۔"

سبطین نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ بھی ذرا گھبرا یا۔ "ارے بھی رافیا کو مر رہ گیا۔"
 لیکن عین نے فوراً سے اطمینان دل دیا۔ "جی دے ابھی گیا ہے۔ جڑی لینے۔ آتا ہو گا۔"

سبطین خاموش ہو گیا۔ رافیا بہت دیر تک واپس نہ آیا۔ گارڈ نے جب آخری سیٹی دی اس وقت وہ لپکا ہوا آیا۔ کھڑکی کا دروازہ بند
 تھا۔ کالے خاب نے بڑی مشکل سے اس کا ہاتھ پکڑ کے اندر کھینچا۔ گاڑی کو ایک جھٹکا سا لگا اور ایک دھیمے شور کے ساتھ ساتھ وہ آہستہ
 آہستہ چلنے لگی۔ باؤس اور افسردہ چہروں کی ایک پوری قطار سامنے سے گزر رہی تھی اس وقت گاڑی کے اندر والوں کے اندر والوں کو یہ
 احساس ہو کہ کتنے لوگ ایسے تھے جنہیں گاڑی میں جگہ نہ مل سکی۔

رافیا کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ اس نے ایک لمبا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میاں میں تو دوسے ہرڑہ میں دیکھیا یا۔ دوسے کہیں بھی نہیں
 ہے۔"

کالے خاب کا افسردہ چہرہ اور زیادہ افسردہ ہو گیا۔

علس تھوڑی دیر تک بالکل خاموش بیٹھا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ ”وے کسی اور اسپیشل سے چل دیا۔“

سبطین کے کان کھڑے ہوئے۔ ”کون چل دیا؟“

رفیانے جواب دیا۔ ”انجی کوئی بھی نہیں۔ دے تھا سپو میاں۔ وے تھا نہیں شیر۔“ اس کا لہجہ اور دھیمہ ہو گیا۔ ”وے دی چل گیا تھا۔“

فیاض خاں کم ستھان بنا بیٹھا تھا۔ خود سبطین کی یہ ہمت نہیں پڑی تھی کہ اس سے بات کرے۔ ”شیر؟“ کے غلط پہ وہ ایک ساتھ چڑکا۔

”کون“ کالے خاں گولند؟ . . .“

کالے خاں نے فوراً اسے ٹوکا۔ ”نہیں میاں۔ میں تیس۔ وے تھا شیر۔“

”شیر؟ . . . شیر و مر گیا۔“

کالے خاں کے چہرے پہ مردنی چھ گئی۔ رفیا کا منہ اور لنگ گیا۔ سبطین حیرت سے کبھی کالے خاں، رفیا اور علس کی صورتوں کو دیکھتا اور پھر فیاض خاں کے چہرے کے سخت ہوتے ہوئے خطوط کو بھٹکتے لگتا۔ اس نے لوگوں کو سنجیدہ دیکھ کر دوسرے ڈبے والے خود بخود سنجیدہ ہو گئے۔ سارے ڈبے میں خاموشی چھ گئی۔ علس گنگلی باندھے فیاض خاں کی صورت کو دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا ”چھ؟ شیر و مر گیا“

”ہاں شیر و مر گیا۔“ مرا گیا۔ ”فیاض خاں کے لہجہ میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا مگر اس کا چہرہ اور سخت پڑ گیا تھا۔ اس پہ ایک مبہم تاریکی پر چھ میس کا پڑ رہی تھی۔

ڈبے میں پھر خاموشی چھ گئی۔ بہت دور سے کسی خواب کی دنیا سے پیوں کی ٹرگڑاہٹ کی آواز آرہی تھی۔ یہ آواز تیز ہوتی گئی۔ اسٹیشن پیچھے رہ گیا تھا۔ سامنے حسن پور کی عمارتیں ایک جھوم کی جھل میں نظر آرہی تھیں۔ اوپر کوٹ کی بہت سی عمارتیں ان میں صاف پہچانی جاسکتی تھیں۔ بعض عمارتیں جل پھنک گئی تھیں۔ بعض پہ صرف کالوس پتی ہوئی تھی۔ بعض کی سیدی جوں کی توں قائم تھی۔ ڈبہ کی صاحب کی بلند حویلی کے کنگروں نے اسٹہ میہ علامتوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔ سبطین گنگلی باندھے دیر تک اس منظر کو دیکھتا رہا۔ گاڑی کی رفتار ورتیز ہو گئی۔ حسن پور کے مکانات کے نقوش مدھم پڑتے جا رہے تھے۔ سامنے ایک روٹی کے کارخانے کا ستون نظر آتا۔ پھر شفا خانے کی عمارت دکھائی دی۔ پھر خالی میدان اکا دکا درخت سامنے آئے۔ حسن پور نے مدھم ہونے ہونے ایک میلی دنگی

کی شکل اختیار کی۔ پھر وہ ایک بدرنگ نقطہ بن گیا۔ پھر یہ نقطہ آہستہ آہستہ قاصلہ کی دوری میں تحلیل ہو گیا بوجی کی پٹوں پر دیر سے ایک قطرہ کانپ رہا تھا۔ انہوں نے دوپٹے کے آئینے سے آئینہ سے آنکھ کو پونچھا۔ پھر برقعہ کی نقاب گرمی اور بوجی نے سر بند کر لیا۔

”مگر اس کا شو ہر کہاں ہے؟“ فیاض خاں نے بہت آہستہ سے پوچھا۔

”نہا دیش مارا گیا۔“

”بہت خوب۔“

سبطین جل کر بولا۔ ”اس کے مرنے کی بڑی خوشی ہوئی تمہیں۔“

”ایک شخص کا مرنا بھی کوئی مرنا ہے کہ اس کی خوشی کی جائے۔ میں دلی میں بہت بڑا جشن دیکھ کر آ رہا ہوں۔“ فیاض خاں نے طنز کا

جوہر طنز سے دیا۔

سبطین مگر ماکر بولا۔ ”تو پھر چہ اغاں کیا ہوتا۔“

”اس کا انتقام تھا۔“

سبطین چپ ہو گیا۔ فیاض خاں کا چہرہ پھر سخت پڑتا چلا گیا اور ایک بہمی سیاہ پر چھائی پھر اس کے چہرے پہ کانپنے لگی۔

بوجی اور دلی والی کے باہمی اختلافات ختم ہو چکے تھے۔ سر سے جوڑ کر وہ کچھ اس طرح باتیں کر رہی تھیں گویا برسوں سے ایک دوسرے کو جانتی ہیں۔ دلی والی کہہ رہی تھی۔ ”اے بوائی۔ وہ مردار میلے سر سے حضرت کے روٹے پہ پھینکی گئی۔ میں نے حواسے دیکھا تو بندی تو تھرا گئی۔ بس یہ سمجھ لو کہ اگلی عصر ات بھی نہ پکڑی لڑائی شروع ہو گئی۔“

برابر میں ایک اور دلی وی بیٹھی تھی۔ مہنگو میں ٹانگ اڑاتے ہوئے بولی۔ ”اجی میں نے تو خانی کے مہینے ہی میں کہہ دیا تھا کہ کچھ ہو کے رہے گا۔ میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ دلی میں دھوم کی برات نکل رہی ہے۔ باجا گا جائے گا گولے مہتابیاں چھٹتے چھٹتے پھواری لٹنے لگی۔ میں صبح کو انھی تو میرا کلیجہ دھک سے رو گیا۔ اے بی وہ دن ہے اور آج کا دن ہے ایک دن چیس کا نہ آیا اور وہ ٹس پڑی کہ دلی کا دھڑ ہو گیا۔“

بوجی کہے لگیں۔ ”اری بی بی میں نے تو جس دن دم دار ستارہ دیکھا تھا۔ اسی دن کہہ دیا تھا کہ غدر پڑے گا۔ نمبر دارنی تمہیں تو یاد

ہے نا؟“

نمبر دارنی نے ثبات میں سر ہلایا۔ ”اے مجھے کیوں یاد نہ ہوتا۔ اس پہ میں نے یہ کہا تھا کہ بھئی آج کل مارے بہت ٹوٹ رہے

”ہاں۔“

فرد کا لفظ دلی والی کے بے بہت خیال انگیز ثابت ہوا۔ بولی۔ ”میری اماں حضرت فرماتی تھیں کہ غدر میں جب لوگوں کی توہیں دھیس تھیں تو یک گوہ ہمارے اٹھائی میں آ کے کراتھا۔ مگر یہ ٹھوٹے تو گوروں سے بھی سوا ہاتھ بڑھ گئے۔ اے بی۔ گوک پہ گولیاں یوں آ کے گریں جیسے چنے بھجن رہے ہوں۔“

نمبر دارنی بحث کو ایک دوسرے رخ پر سوزنا چاہا۔ ”اری بی بی۔ بڑی تباہی آئی۔ روپیہ پیسہ مال اسباب سب پانی کے ریلے میں بہہ گیا۔“

بوجی بات کا نئے ہوئے بولیں۔ ”اے ٹھوڑے پیسے کا کیا ہے۔ خاک سی چیز۔ وہ تو ذمہ داری بھرتی چھوٹ ہے۔ آج یہاں کل وہاں۔ مگر میں تو یہ کہوں ہوں کہ آبرو موتی کیسی آسب ایک دفعہ جا کر پھر نہیں آتی۔ بس میرا تو نہیں ہوں میں دم لگا تھا کہ کہیں آبرو۔“

”اے بی آبرو اب وہاں کہاں رہی۔“ بوجی کی بات دلی والی نے کاٹی۔ ”آپ پر اسنے قلعہ میں ہو تھیں تو دیکھ دیکھ کر فٹش کرنے لگیں۔ آج کل کی لڑکیاں ہیں آفت کا پرکا۔ ہیں اس افرا تفری میں تو اے لوائے اوسان خطا ہوتے تھے۔ مگر ان کا تو وردیدہ پھٹ گیا۔ مرداریں کھل نکلیں۔“ اس کی آوار نے سرگوشی کی شکل اختیار کر لی۔ ”اے بی آپ کو کیا بتاؤں۔ یہی ہی بات ہے۔ یہ گھٹنا کھولوں ہوں تو وہ گھٹنا کھلے ہے۔ وہ گھٹنا کھولوں ہوں تو یہ گھٹنا کھلے ہے۔ پر اسنے قلعہ میں روز بھی رہتا تھا۔ جس کی بات نکل گئی۔ اس نے بیوہ رچالیا۔ خاک اسکی شادی پہ نہ مہندی نہ سندور نہ اہنا۔“

نمبر دارنی غصہ سے بولیں۔ ”ٹھوڑی شر میں بھی اٹھ گئیں۔ وہ جو کسی نے کہا تھا کہ ایک زمانہ آئے گا کہ گائے گوبر کھائے گی اور بیٹی برائے گی تو وہ یہی زمانہ آ گیا ہے۔“

”ہاں بی بی۔“ بوجی ٹھنڈے سانس بھرتے ہوئے بولیں۔ ”بڑا خراب زمانہ آ رہا ہے۔ یہ دنیا اب رہنے کی جگہ ٹھوڑی ہے۔ کتوں چالی اٹھ رہا ہے۔“

بوجی کے فقرے نے اپنا اثر دکھایا۔ فضا میں افسردگی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ رفتہ رفتہ بوجی پہ غنودگی طاری ہو گئی۔ دلی والی نے بھی دو گھنٹا شروع کر دیا۔ گاڑی بدستور چمک چمک کرتی چلی جا رہی تھی۔ اسٹیشن آئے اور کل کل گئے۔ گاڑی جس اسٹیشن سے گزری۔ پلیٹ فارم خالی نظر آیا اور گیٹ کے جنگلوں پہ ایک ٹھنڈہ دکھائی دیا۔ اسٹیشن سے ہٹ کر لوگ جا بجا قطار باندھے غور سے یہ تماشا دیکھتے نظر آئے۔ حسن پرداؤں کی بارات نکل رہی تھی۔ جس نے اس بارات کو دیکھا ٹھٹھک کر رہ گیا۔ سہارن پور کے اسٹیشن سے گزرتے

ہوئے گاڑی کی رفتار دھیمی ہوئی سٹیشن گزر گیا۔ رفتار پھر تیز ہو گئی۔ اب شام ہو چکی تھی۔ جس تیزی سے گاڑی چل رہی تھی۔ تقریباً اسی تیزی سے دونوں وقت طے اور جدا ہو گئے۔ پکا ایک کوئی بولا۔ "اب مشرقی پنجاب شروع ہونے والا ہے۔" یہ فقرہ بہت آہستگی سے اور بہت ڈرتے ڈرتے کہا گیا تھا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اکثر صورتوں میں ڈھول پٹنے جائیں اور گھروں کی چھتوں پہ کھڑے ہو اور کچے خطاب کیا جائے۔ پھر بھی کوئی نہیں سستا اور بعض فقرے ہونٹوں سے نکل نہیں پاتے اور لوگوں کے کانوں میں پہنچ جاتے ہیں اونٹوں سے نکلے کوٹھوں چڑھی دن مثل خواہ کھو تو پیدا ہوئی نہیں تھی۔ ایک شخص نے ہونٹ بھر پھرانے۔ سب کے دس دھڑکنے لگے۔ ڈبے میں خاموشی چھا گئی۔ خاموشی نے سرگوشیاں کو جنم دیا۔ "ننگلو کا شروع ختم ہو گیا۔ سارے موضوعات پس منظر میں جا پڑے۔ اب ہر شخص کے سب پر مشرقی پنجاب کا ذکر تھا۔ پھر کسی نے آہستہ سے کہا "لو بھئی" بڑی بڑی کی سرحد ختم ہو گئی۔" واقعہ یوں ہے کہ یہ فقرہ کہا نہیں گیا تھا۔ صرف محسوس کیا گیا تھا اور ایک کونے سے دوسرے کونے تک سنا سنا چھا گیا گاڑی چلتی رہی پیہوں کی گھڑ گھڑ کا شور ہوتا رہا اور سنا سنا طاری رہا۔ پھر دی والی کا بچہ رو پڑا۔ اس نے کھٹ سے کھٹا اٹھایا اور اپنی چھاتی منہ میں دے دی مگر چھاتی پھوڑنے کی آواز بعد تک آتی رہی۔ نوابن میں جرات گفتار شاید اسی آواز نے پیدا کی تھی۔ اس نے نبرداری کے کان میں کھسک پھسک کر کرنی شروع کر دی۔ دن کی کھسک پھسک سے بوجی کا حوصلہ بندھا اور وہ دی والی کے کانوں میں ہاتھیں کرنے لگی۔ چر دغ سے چر دغ جلتا ہے اور حوصلہ سے حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ ایک خربوزے کو دیکھ کر دوسرے خربوزے نے جو رنگ پکڑا تھا وہ باقی خربوزوں میں خود بخود منتقل ہوتا چھا گیا۔ سرگوشیاں پیہے تو اس قدر مدھم تھیں کہ بس یوں معلوم ہوتا تھا کہ خاموشی سانس لے رہی ہے۔ پھر خاموشی زور زور سے سانس لینے لگی۔ پھر سانس میں خرابیوں کی کیفیت پیدا ہوئی شروع ہوئی۔ کانا پھوسی کرتے کرتے کسی کی ذرا زور سے آواز نکل گئی۔ دوسری ٹولی میں کسی بزرگ نے خود اعتمادی کے مظاہرے کی غرض سے خودی کوئی فقرہ بلند آواز سے کہہ دیا۔ یوں سرگوشیوں کو آواز مل گئی۔ لیکن اس بڑھتے ہوئے عمل میں پکا ایک پھر پھر لگ گئی گاڑی کی رفتار دھیمی ہوئی گئی دھیمی ہوئی گئی اور آخر گاڑی رک کر کھڑی ہو گئی۔ "حمد ہوگا۔" یہ فقرہ وجدان کی زبان سے ادا ہو اور دونوں میں اترتا چلا گیا پھر خاموشی چھا گئی۔ ڈبے میں اندھیرا تھا۔ اس بے یہ تو پتہ نہ چل سکا کہ لوگوں کے چہروں کی کیا کیفیت ہے۔ لیکن اتنا تو صاف محسوس ہوتا تھا کہ سب کے دل دھڑ دھڑ کر رہے ہیں۔ دور دور تک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ گاڑی ساکت و جامد کھڑی تھی۔ گاڑی کا ہر مسافر اپنی جگہ جمکا ہوا تھا۔ بس یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس پوری گاڑی کو سانپ سو گھ گیا ہے۔ اندھیرے میں کسی صورت کی دکھائی دیتی۔ بس بہت سے ساکت و جامد سایوں کا ایک جھوم دکھائی پڑتا تھا۔ دفعتاً یہ سوائی گھسنے کی آواز اور آواز سے روشنی پیدا ہوئی۔

”یہ کون بے وقوف ہے؟“ حق صاحب نے دہلی آوار سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”یہ میں بے وقوف ہوں۔ فرمائیے کیا فرماتے ہیں آپ۔“ یہ آواز فیاض خاں کی تھی۔ حق صاحب کو سانپ سونگھ گیا۔

دیکھنے کو نے سے کوئی جھپٹن ہوا۔ ”اے صاحب! سگریٹ بھائیے روشنی کی سیدھ میں گولی آئے گی۔“

فیاض خاں نے ”اے صاحب“ کا ٹکڑا طنز نوہراتے ہوئے کہا۔ ”اے صاحب۔ آپ کو میری تمہی سے ایسی کیا دلچسپی ہے۔ میں پوچھا ہوں گا۔ ہو جانے دیجئے۔ آپ تو پاکستان اپنی تمہی سمیت پہنچیں گے۔“

”پاکستان میں لوہے کے چنے چاہئے پڑے تو خاں صاحب کیا کریں گے۔“ یہ دہلی آوار قابا رنیا کی تھی۔ اس کے برابر عین بیٹھا تھا۔ اسی کے کان میں یہ بات کہی گئی ہوگی۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ فیاض خاں بدستور سگریٹ چٹا رہا۔

”تو بہ تو بہ بڑی گھنٹ ہے۔ نگوڑی گاڑی“

یہ آواز شاہید دی وی کی تھی جسے سبردار صاحب نے سچ میں کات دیا۔ ”کون ہے یہ خاموش رہو۔“

سکوت کی کیفیت پھر طاری ہو گئی لمبے طویل سے طویل تر ہوتے چلے گئے پھر وقت قہم کیا۔ وقت اور ریل گاڑی کی دیکھا دیکھی ہوا بھی رک گئی تھی۔ ڈبے کے اندر اس سے لوگوں کا برا حال تھا۔ لیکن کسی کو ہلنے کی ہمت نہیں تھی۔ ایک ایک کسی پیچھے کے ڈبے سے نیچے کے رانے کی آواز آئی اور کسی نے بے ساختہ کہا۔ ”حمد ہو گیا۔“ اس فخر سے پہ ایک اضطراب کی کیفیت پیدا ہوئی۔ فیاض خاں نے بلند آواز سے کہا۔ ”کیوں صاحب یہ کس بزرگ نے حمد کرایا ہے؟“ خاموشی پھر عود کر آئی۔ فضا میں ایک سناٹے کی کیفیت طاری تھی۔ گاڑی جی کھڑی تھی۔ ہر مسافت بت بنا بیٹھا تھا۔ لوگوں کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے تھا۔ آخر گاڑی کو اچانک ایک جھٹکا لگا۔ گاڑی چل پڑی حملہ نہیں ہوا تھا۔ لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ پر چھائیوں کو حرکت ہوئی۔ خاموشی ٹوٹ گئی۔

گاڑی کے ساتھ ساتھ ہو بھی چلی۔ گرمی اور گھنٹ کم ہوئی تو گرمی اور گھنٹ کا احساس پیدا ہوا۔ اس کا اظہار سب سے پہلے نواہن نے کیا۔ ”اے تو بہ! میر تو گرمی کے مارے اچار پڑ گیا۔“

فیاض خاں نے بہت آہستہ سے سہیلین سے پوچھا۔ ”وہ چٹنی کی ہنڈیا کدھر ہے؟“

”اس بھلائے میں مت رہنا۔ چٹ کر جائے گی اور ڈکار نہیں لے گی۔“

”تم اسے چٹوری سمجھا کر دے پتے یہ تو دو چاٹ ہے۔“

سبطین حسب دستور پھر خاموش ہو گیا۔

گازی کی تیز رفتاری میں اب یکسانیت پیدا ہو چکی تھی۔ یوں باتیں بھی بڑی تیز رفتاری سے شروع ہوئی تھیں۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کا بھی زور گھٹنے لگا۔ گلشن نے بستر پہ بیٹھے بیٹھے اطمینان سے خراٹے لیے شروع کر دیے تھے۔ بوجی کا سردیوار پہنک گیا تھا۔ لیکن انہیں آرام سے سونا نصیب نہ ہوا۔ دلی والی عین کھڑکی کے سامنے بیٹھی تھی۔ سر کیاں نکالتی۔ جب اسے اٹکھ آتی تھی تو اس کا سر ڈھلک کر بوجی کے شانے پہ ٹک جاتا تھا اور بوجی پھر چونک پڑتی تھیں یہی حرکت نوابین نہرو داری کے ساتھ کر رہی تھی۔ لیکن نہرو داری اس قسم کے ہلکے پھلکے رخنوں کو کب خاطر میں لاتی تھیں۔ بلو نے پاؤں بھاری ہونے کی وجہ سے اتنی رعایت تو حاصل کر لی تھی کہ اسے صندوق کی بجائے نشست پر جگہ مل گئی تھی۔ مگر وہ اتنی جگہ کہاں تھی کہ وہ اپنے گھڑے سے پیٹ سمیت آنکھ لگا سکتی۔ ایک تو نندھیر اور پھر بے ڈھنگی لقل و حرکت بیٹھنے والے کہیں سے کہیں پہنچ گئے گلشن واصل بوجی کی ناگوں اور دلی والی کی ناگوں کے بیچ میں جا گئی۔ نہرو داری نے در پوٹ شاپ خانے تک جانے کی خطا کی تھی۔ واپس جو آئیں تو نوابین نے کچھ اس طرح سے زاویہ بدل لیا تھا کہ انہیں صندوق پر جگہ تو مل گئی۔ لیکن تھوڑی سی دیر بعد وہ اس سے کھسک کر بستر پا جا رہیں اور اس کا سر بوجی کی ناگوں کی بجائے فرحت کی ناگوں پہ جا لگا۔ جو غلطی نہرو داری سے ہوئی تھی۔ وہ افسری سے بھی سر درد ہوئی واپسی پر اس سے بوجی کے قریب بیٹھے کی کوشش کی تھی مگر وہ بگڑا سو بگڑا پیادہ بات ہے کہ افسری نے بگڑے ہوئے زاویے کو کچھ زیادہ بگڑا ہوا نہیں سمجھا۔

گازی رک رک کر چلی اور چل چل کر رک۔ چلتے چلتے دفعہ

”جنگل“

میں کھڑی ہو جاتی لوگ چونک پڑتے۔ پھر اس کے سپاہی اترتے جنگل میں فلپش لائن پھینکتے۔ ایک دو ہوائی فائر کرتے اور گازی پھر کائنی شروع ہو جاتی۔ پھر باتیں ہونے لگتیں اور لوگ پھر اوجھلنے لگتے۔ فیاض خاں اور سبطین بدستور جاگ رہے تھے۔ ان کی آنکھ چل بھر کے سے نہیں لگی تھی۔ سبطین نے یہ غلط فہمی کی تھی کہ داروئی میں کیپشن کے دو تین ڈبیاں جیب میں بھر دیا تھا۔ ان ڈبیوں نے بڑا کام دیا۔ ان کے بل پہ دونوں نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی وہ کیوں جاگ رہے تھے؟ ڈر کی وجہ سے؟ مگر علیٰ ارطالان ڈر نے والے یا باتیں کر رہے تھے یا خراٹے لے رہے تھے۔ سبطین کوئی بات کہتا فیاض خاں اس کا جواب دیتا۔ مختصر جملوں میں مختصری گفتگو ہوئی اور دونوں خاموشی سے سگریٹ چنے لگتے۔ اس کی آوازیں خشک تھیں۔ ایسے موقعے بہت کم آئے جب ان کی سوز میں واقعی افسردگی کا رنگ پیدا ہوا۔ ان موقعوں پر اکثر یوں ہوا کہ جب فیاض خاں کے لہجہ میں افسردگی پیدا ہوئی۔ تو سبطین نے طنز کیا اور

جب سبھین کی آو میں رقت پیدا ہوئی تو فیاض خاں نے قہقہہ لگایا۔ بس اوقات آدمی کا چہرہ دل کا غم رہن جایا کرتا ہے۔ لیکن سے کیا کہئے کہ ڈبے میں گھپ اندھیرا تھا۔ ان کے چہرے پہ جو کیفیت بھی ہو وہ اس پردے میں چھپی ہوئی تھی۔ اس رات اس اندھیرے نے بہتوں کے پردے دکھے اور بہتوں کے دلوں کے راز ظاہر کر دیئے۔ اندھیرے میں بلا کیا معلوم دیتا۔ نہ فیاض خاں اور سبھین کے چہرے نظر آتے تھے اور نہ اسری کا بے نقاب چہرہ دکھائی دیتا تھا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ مختلف نازک موقعوں پر اس کے چہرے پہ کیا کیفیت گزری۔ اس کا علم بھی عالم الغیب ہی کو ہے کہ اس نے اراد کیا کیا تھا یا واقعی غنودگی کے عالم میں اس کا سرفیاض خاں کے شانے پہ جا لگا تھا۔ فیاض خاں سے پہلے تو کسی قلعی سی شے کو اپنے بدن سے لگتے ہوئے محسوس کیا اور پھر ایک معطر سر ڈھلک کر اس کے شانے پہ تنک گیا۔ فیاض خاں نے بڑے سکون کا مظاہرہ کیا۔ چند منٹ تک وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ پھر اس نے دھیرے سے اس کا سر اٹھا کر الگ کیا اور چپکے سے اس کے کان میں کہا۔ گھر سے نکلیے کر نہیں چلی تھیں؟" یہ بات بھی پردہ پار کی ہی میں رہی کہ اسری پر اس فقرے کا کیا اثر ہوا۔ البتہ جب فیاض خاں نے سگریٹ کا زور سے کش لیا تو اس کی روشنی میں اتنا نظر آیا کہ اسری کی ہنویں تلی ہوئی تھیں۔ غالباً چہرہ بھی سرخ پڑ گیا تھا لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ محض سگریٹ کی سرخ لوکا کرشمہ ہو۔ گاڑی چلتے چلتے پھر رک گئی اور جگ جگل میں رکی۔ حق صاحب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ کیا ہوا بھئی؟"

"معد ہونے والا ہے۔" سبھین نے بڑے سکون سے حق صاحب کو اطلاع دی۔ اے حق صاحب کو بتانے میں اس بھی مزا آتا تھا۔

فیاض خاں نے برجستہ کہا۔ "مجھ پہ تو معد ہو چکا۔"

حق صاحب دونوں کو سمجھتے تھے۔ سمجھ گئے کہ خواہ مخواہ بنکارتے ہیں۔ گاڑی ایک جھکے کے ساتھ پھر چلی نکل۔ حق صاحب نے ہنا وقت گنوانا مناسب نہ سمجھا۔ جس پھرتی سے جا گئے تھے۔ اسی پھرتی سے پھر سو گئے۔ گاڑی کی رفتار تیز ہوتی چلی گئی اور جاگ پڑنے والوں پر غنودگی کا جادو اسی رفتار سے پھر چڑھنے لگا۔ فیاض خاں نے ڈیپا سے نئی سگریٹ نکال کر جلدی اور زور اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔

گاڑی کی رفتار پھر دھیمی ہو چلی تھی۔ رات کی سیاسی ڈھل چکی تھی۔ لیکن ایک دھند کی کیفیت بھی باقی تھی۔ چاروں طرف فضا میں ایک بدرنگ دھند کی کیفیت طاری تھی۔ میدان اور کھیت دور تک اجاڑ پڑے تھے۔ جا بجا مویشیوں کے پورے پورے ڈھانچے اور خالی کھوپڑیاں پڑی دکھائی دے رہی تھیں۔ انسانی لاشیں بھی جا بجا نظر آئیں۔ میدان اور کھیتوں سے پرے ایک چھوٹی سی جڑی ہوئی ہستی اپنے ٹکینوں کا ماتم کر رہی تھی۔ بہت سے کچے مکانات تو بالکل ڈھیر ہو چکے تھے۔ کسی کسی کی ایک آدھ دیوار ضرور کھڑی رہ گئی

تھی۔ پکا مکان ممکن ہے اسی بستی میں یک ہی ہو۔ اس کی کیفیت یہ تھی کہ دودھ واریں خالی کڑیوں کو دوش پہ سنبھالے کھڑی رہ گئی تھی۔ باقی سارا مال مسارہ نے طبہ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ایک اجلا سا سفید مینار یہ بتانے کو باقی رہ گیا تھا کہ یہ بستی مسجد سے محروم نہ تھی گاڑی کی رفتار اور آہستہ ہو گئی۔ رفتہ رفتہ ہونے کے ساتھ ساتھ آواز میں بھی تبدیلی پیدا ہوئی کئی سفید کھجے گاڑی کے برابر آئے اور نکل گئے۔ رہا چمک کر بولا۔ "ابے ملن۔ ابے ادا کالے خاں۔ ابے اٹھو بے نامر تر آ گیا۔"

کالے خاں اور ملن دونوں نے بڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ "امر تر آ گیا؟"

کئی طرف سے آدیں بلند ہوئیں۔ "کیوں بھی امر تر ہے؟"

ایک طرف سے آواز آئی۔ "مر تر ابھی کہاں بھائی۔ یہ تو مجھے جالندھر لگے ہے۔"

اس پہ کسی نے لکڑا لگایا۔ "میاں گھاس کھا گئے ہو۔ جالندھر امر تر کے بعد آتا ہے۔"

"جالندھر تو رات گزر بھی گیا۔" یہ انکشاف حق صاحب کی طرف سے کیا گیا جو رات بھر سنے تھے۔

"بھئی ہمارا آ رہا ہے۔" نمبر دار صاحب نے قطعی انداز میں کہا۔

لیکن جب پیٹ فارم کے آواز پر لدھیانہ کی تختی نظر پڑی۔ تو ساری قیاس آرائیاں ختم ہو گئیں اور حسب دستور ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔ گاڑی پیٹ فارم پر پہنچی کر رک گئی۔ پیٹ فارم پہ جا بجا شرٹا تھی ڈیرے ڈالے پڑے تھے۔ بعض شرٹا تھیں نے اپنے ٹیمپوں کی حدیں اپنے بکس اور ٹرنک جس کر قائم کی تھیں۔ بعض شرٹا تھیں نے محض چارپائی کو کھڑ کر بیٹائی کافی سمجھا تھا۔ یک کھ شرٹا تھی نے ایک بیچ پر بستر بنا کر اپنا ٹھکانا کیا تھا۔ سامنے دوسرے پیٹ فارم پہ شرٹا تھیں کی یک گاڑی لدی پھندی کھڑی تھی۔ جس کے ڈبوں سے زیادہ چھت پہ بھجوم تھا۔ چند ایک بکڑے دل انجن پہ جا کے ٹک گئے تھے۔ ایک نوجوان کھ شرٹا تھی نے دو ڈبوں کے بیچ میں بڑے آرام سے زنجیروں میں اپنا گھوملہ بنالیا تھا۔ مہاجروں کے اس غول کو وہ اس بری طرح تک رہا تھا۔ گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں کھا جائے گا۔ مگر ایک اس پہ ہی کیا منحصر تھا۔ وحشت تو ہر آنکھ سے برس رہی تھی۔ پیٹ فارم پہ گھومنے والے سکھوں نے کچھ اور ٹھسے کے ساتھ ٹھلنا شروع کر دیا تھا اور اپنی نگلی گواروں کو کچھ اور زیادہ غمایاں کرنے کی کوشش کر رہے تھے گاڑی کے اندر موت کا سناٹا طاری تھا۔ نمبر دار فی نے صرف چنگی کے زریعہ فرحت کو ہدایت کی تھی کہ کبھت اس وقت تو منہ ڈھکے۔ نوجوان عورتوں نے تقریباً سب نے ہی اپنے منہ ڈھک لیے تھے۔ البتہ افسری نے اس سیٹے میں کوئی اہتمام ضروری نہ سمجھا۔ اس نے نہ تو نقاب یکسر اٹھائی اور نہ اسے بالکل گرایا ہی۔ کبھت نوابین کے غوطے کو بھی اسی وقت ہوتا رہ گیا تھا۔ اس نے بڑے سکون سے لغو

سر کی شروع کی۔ "میں مشہور جی سمیٹو" خطاطوں نے کی اور لوگوں نے گھورتا شروع کیا نواہن کو۔ نواہن غریب نے اسے بہت چکارا اور دبی آواز میں کہا۔ "میں مشہور اس وقت چپ ہو جاؤ۔" مگر جب وہ چپ نہ ہوا۔ اور نیردانی بے اشاروں اور نگاہوں سے بڑھ کر دبی ہوئی آواز میں سمیٹو کی تو نواہن نے غصہ میں آ کر بنجرے کو جھوڑ مارا۔ طوطے نے کلکاریاں لگائیں۔ پر پھڑ پھڑائے اور پھر ایک تکی سے چمت کر دیا حیرت سے اپنے ارد گرد کے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ اس کا مختصر سا جسم ایک کانپتی ہوئی سی شے بن کر رہ گیا تھا۔ دن و دی کی صندوقی نے بھی پر پرزے نکالنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس نے گود میں اسے ایسا بھیجا کہ وہ غریب پھر سناٹا ہی نہ کی۔ خاموشی بہت دیر تک طاری رہی۔ لیکن خاموشی کا سب سے کمزور پہلو یہی ہے کہ وہ بہت دیر تک طاری نہیں رہ سکتی۔ پہلے جسم حرکت میں آئے۔ پاس والوں سے پرے سرکنے کی دبی آوازوں میں التجائیں کی گئیں۔ پھر کھسک پھسک ہونے لگی۔ ہاں جب کوئی شرنا تھی گاڑی کے برابر سے گھورتا ہوا اٹھتا تو سناٹا اچھا جاتا اس کے گر جانے پہ پھر کھسک پھسک شروع ہو جاتی۔ حق صاحب بے فکر بہت ڈرے ہوئے تھے لیکن یہ واقعہ ہے کہ سکھ اسٹیشن ماسٹر سے گفتگو کرنے کا حوصلہ سب سے پہلے انہوں نے ہی کیا تھا۔ جب وہ ڈپے کے برابر سے اندر بھاٹکتا ہوا گزر رہا تھا تو حق صاحب نے پہلے تو "سردار جی" کے خطاب کے ساتھ بڑے محنت آمیز لہجہ میں سلام بھکایا۔ اس کے بعد وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے۔ لیکن سردار جی نہیں گھورتے ہوئے چلے گئے۔ اور حق صاحب نے چنے ہونٹوں پہ جو مسکراہٹ پیدا کی تھی وہ ہونٹوں پہ اچھی طرح پھیلنے سے پیسے ہی مر گئی۔ فیاض خاں نے بہت گھور کر حق صاحب کو دیکھا اس کے چہرے پہ سرخی دوڑ گئی۔ اس نے بہت تیزی سے انداز میں حق صاحب کو دیکھا اور بولا۔

"کیوں جی حق صاحب کیا کہہ رہے تھے اس سے۔"

حق صاحب خفیف ہو کر بولے۔ "کچھ نہیں بھئی یہ پوچھتا تھا کہ گاڑی کب چلے گئی؟"

"نیچے، ترکر پوچھ آئیے نا۔" سبطین نے آہستہ سے کہا۔

حق صاحب اس فقرے کو شربت کا گھونٹ سمجھ کر پی گئے۔

خدا خدا کر کے گاڑی نے سرکنے کا نام لیا۔ لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اطمینان نے بھوک کا احساس دلایا۔ ہنڈیاں دیکھیں! ڈبے ناشتہ دان کھنا کھٹ کھنٹے لگے۔ جن لوگوں کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ ان میں سے ایک بڑی تعداد کو علین نے چنے اور گڑ اور بودار دھڑیاں سپلائی کیں۔ علین نے یہ واقعی ٹھکانہ کی تھی کہ چلتے وقت اپنی دکان کے سارے چنے گڑ دھنیاں گولا چھوڑے لہڑیاں اور مابل چادر میں باندھ لایا تھا۔ علین کی فیاضی سے بہتوں نے فائدہ اٹھایا۔ آخری کو نے میں ایک صاحب نے چنے مالوں

کا بھڑا بلند کرتے ہوئے کہا۔

”اے صاحب! ہمارے مال بھوک سے دم توڑ رہے ہیں۔ دودھ دینے چنے کے دے دو۔“

کالے خاں نے چنوں کی لپ بھری اور خود اس شخص کی گود میں ڈال کر آیا۔ فیاض خاں نے سبطین کے ناشتے میں حصہ ہانے سے صاف انکار کر دیا۔ بوجی نے بہت برا مانا۔ مگر اس نے ایک نہ مانی۔ عین سے چنے لے لینے میں اس نے کوئی عذر نہیں سمجھا۔ مگر اس نے چار پانچ پھکیوں میں ان کا صفایا کر دیا۔ کالے خاں نے اسے ایک گڑ دہانی بھی دی تھی۔ جسے وہ ایک دار میں چٹ کر گیا۔ اس کے بعد اس نے کالے خاں اور عین دونوں کی ساری پیشکشوں کو رد کر دیا اور سبطین کے لوٹنے کی ٹوٹنی سے منہ لگا ٹٹ ٹٹ ”دھاوٹا پانی چڑھا گیا۔ دراصل بوجی افسری کو بھی تھوڑے سے ناشتے سے نوازنا چاہتی تھیں۔ افسری اپنے چند ایک کپڑے اور کنگھی ہٹی کا سامان تو ضرور ساتھ لے سکی تھی۔ لیکن کھانے پینے کے نام اس کے پاس دو چپا تیاں سے زیادہ کچھ نہ تھا اور وہ رات ہی ختم ہو گئی تھیں۔ لیکن حق صاحب نے بوجی کو زحمت کرنے سے روک دیا۔ انہوں نے دو چپا تیاں اور دو شامی کہا ب ککشن کی معرفت کھٹ سے اس کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ اس سے پہلے وہ کئی چھوٹی موٹی مہربانیاں افسری پر اور بھی کر چکے تھے۔ شاید اسی لیے اس نے ان کا خوان قبول کر لینے۔ میں کچھ بہت زیادہ چھر بھر نہیں کی۔ پانی کا گلاس بھی وہ اسے پیش کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن افسری نے جلد برقی اور بوجی سے پانی لے لیا۔ اس پر سبطین اور فیاض دونوں نے کچھ اس انداز سے حق صاحب کو دیکھا شروع کیا کہ وہ غریب بوکھلا گئے۔

رفیہ نے چپکے سے عین کے کان میں کہا۔ ”بے عین بوکیل تو فروپ لٹو ہو گیا۔“

عین نے برجستہ جواب دیا۔ ”وہ بھی پھر کئی ہے۔ اسے کھنی کا ماتی نپا دے گی۔“

گاڑی یک چھوٹے سے اسٹیشن پہنچی کر بھر رک گئی۔ اب ٹیکا ٹیک دو پہری کا وقت تھا اور لوگوں کے پاس پانی ختم ہو چلا تھا۔ سارے مل چل رہا تھا۔ لیکن کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ اتر کر پانی لے آئے۔ فیاض خاں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ لوہا بن کا کنستریا اور نیچے تر گیا۔ اسے دیکھ کر کالے خاں اور سبطین بھی مل پہنچی گئے۔ جب انہوں نے مسلسل پانی لانا شروع کیا اور کوئی حادثہ رونما نہ ہوا تو دوسروں کی بھی ہمت بندھی اور پھر تو بالٹیوں، گھڑوں، کنستریوں، لوٹوں، ڈونگوں اور گلاسوں کی ایک لین ڈوری لگ گئی ڈبے میں جتنی بے ولی وارث عورتیں تھیں انہیں پانی فراہم کرنے کا فرض فیاض خاں اور کالے خاں نے انجام دیا۔ سبطین نے بھی یہ فرض انجام دینے کی نیت تو باندھی تھی لیکن غریب رحمت پان سا آدی دو بالٹیوں کے بعد اس کا دم پھول گیا۔ خیر اس کی طرف سے رفیہ کا کام انجام دے رہا تھا۔ رفیہ اور عین نے بہت سے موٹے مستندے مردوں کو بھی پانی لانے کی زحمت سے بچایا۔ جن میں حق صاحب اور نمبردار صاحب

کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ فیاض خاں نے جن بے والی وارث عورتوں کو پانی لا کر دیا تھا۔ ان میں افسری شامل نہیں تھی۔ اسے نے اس کا ہونا بھرنے کی پیشکش ضرور کی تھی۔ مگر افسری نے اس پیشکش کو بڑی رحمت سے ٹھکرا دیا۔ فیاض خاں نے اسی رحمت سے اپنی پیشکش واپس لے لی۔ البتہ جب فیاض خاں کے چلے جانے پر حق صاحب نے اپنی بائیں میں سے اس کے لوتے میں پانی بھرا۔ تو اس نے نہیں حقارت سے تو ضرور دیکھا مگر منع کرنے کا تکلف نہیں کیا۔

گاڑی پھر چل پڑی اور اپنی اسی پرانی چال سے چلی۔ جس بے ڈھنگے انداز میں رکتی تھی اسی بے ڈھنگے انداز میں چلتی تھی۔ جب آس ہائل ٹوٹ جاتی تھی تو گاڑی چانک چل پڑتی تھی۔ جب رکنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تو پکا ایک پیپے چرٹ چوں کرتے اور گاڑی، زکڑکڑی ہو جاتی۔ فضا ڈراؤنی۔ مناظر یکساں اور بے کیف اسٹیشنوں کو دیکھ کر یوں لگتا تھا۔ کہ برسوں سے بن میں جھاڑ نہیں دی گئی۔ کھیٹ اور میدان جاڑ سنسان۔ جا بجا مویشیوں کے ڈھانچے اور اکا دکا انسانی ناٹھیں۔ جلی پھٹی بستیاں۔ سہار مسہریں۔ برہادی کے مناظر میں بھی کتنی یکسانیت ہوتی ہے۔ فیاض خاں اور سبطین علی ہاندھے ان مناظر کو اس یکسوئی سے دیکھ رہے تھے کہ شاید انہیں یہ احساس بھی نہ رہا تھا کہ وہ گاڑی میں بیٹھ کر یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ بہت دور میدان میں ایک دھڑلے سانپ کی طرح تل کھاتا ایک طویل قافلہ ریٹکتا چل رہا تھا۔ گاڑی چلتی رہی چلتی رہی اور ٹھیک بیاس کے پل پر پہنچی کر رک گئی۔ قافلہ ریل کی ٹانگ کو کاٹتا ہو کر رہا تھا۔ چٹکڑوں اور تیل گاڑیوں کا ایک سلسلہ بہت دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ خاک آلود چہرے خوف سے رزرتے ہوئے جسم و ہشت آلود آنکھیں ان کے سروں کے بڑے بڑے گھڑ اور چوڑے چکے تہند اور قد آور جسم بتا رہے تھے کہ یہ لوگ بھی ضرور بہادر ہوں گے۔ انہوں نے نہ معلوم کیسے کیسے معرکے مارے ہوں گے اور کیسے کیسے سوراخوں سے ٹکریں گی۔ مگر وقت کی ایک جنبش نے انہیں بردل بنا دیا تھا اور وہ اپنے خون سے سبھی ہوئی زمینوں کو اپنی آبائی بستیوں کو یوں چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ جیسے بھونچوں میں لوگ گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر بھاگتے ہیں۔ بھونچال واقعی آیا تھا۔ بھونچال غوں برساتا اور انگارے اٹھاتا آیا تھا اور لوگ اپنے گھروں اور اپنی جائیدادوں کو اپنی جمع جتھ اور اپنے ساز و سامان کو اپنی آبرو کو اپنی آن کو عرض سب کچھ چھوڑ کر بھاگ نکلے تھے۔ جو لوگ گھوڑے کو داتے میدانوں میں داخل ہوئے تھے۔ آج چٹکڑوں اور گاڑیوں میں بیٹھ کر یہاں سے رخصت ہو رہے تھے۔ تاریخ میں ٹکرا رہی کاٹھیں طرک کا پہلو بھی شامل ہے۔ گاڑیاں اور چٹکڑے گزرتے چلے گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے قافلہ تھا۔ بوڑھے نوجوان بوجھیں عورتیں حاملہ عورتیں بچیاں غرض ہر قسم کے لوگ تھے۔ نوجوان عورتیں بھی تھیں۔ مگر نسبتاً کم۔ ڈھائی گھنٹے میں خدا کر کے یہ قافلہ ختم ہوا گاڑی نے سیٹی دی۔ اور چل نکل۔

گاڑی چلتی رہی، رکتی رہی۔ رکتی رہی چلتی رہی۔ دونوں وقت پھر تیزی سے ملے اور جدا ہو گئے۔ اجاڑ میدان اور جلی پھٹکی ہستیاں تارکی میں روپوش ہو گئیں۔ رات گئے امرتسر اسٹیشن سے گاڑی تیزی سے گزری اور آگے بڑھ گئی۔ مگر جب آگے چل کر گھنے جنگل میں گاڑی رک گئی تو لوگوں کا کلیجہ پھر دھک سے رہ گیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد پیہوں کو پھر جنبش ہوئی اور گاڑی چل نکلی۔ اناری کے اسٹیشن پر پہنچ کر پاکستان کی امانت پاکستان کے سپاہیوں کے سپرد ہوئی۔ وہاں سے گاڑی ڈراہڑی تھی کہ ان تمام لوگوں نے جواب تک بہت دیکھے دیکھائے اور ڈرے سبھے بیٹھے تھے۔ پھر ریری ٹی۔ رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ جذبات کی حرارت اظہار کے لیے نعروں کا سہارا اٹھانے لگی۔ پاکستان رند و باد کے نعروں سے ہر ذبہ اور ذبہ سے باہر کی فضا گونج اٹھی۔ حق صاحب نے کچھ اس انداز سے پھر ریری ٹی جیسے منہ پڑنے کے بعد مرغا اپنے گیلے پر جھڑتا ہے گردن پھداتا ہے اور پھر گلڑوں کو صدا بلند کرتا ہے۔ وہ چانک کھڑے ہو گئے۔ جوش میں اور بہت سے لوگ بھی کھڑے ہو گئے تھے اور فرے لگا رہے تھے۔ چنانچہ پہلے تو حق صاحب کی کسی نے نہ سنی۔ لیکن رفتہ رفتہ انہوں نے مجمع پر قابو پالیا۔ اب ان کی آواز صاف سنی جاسکتی تھی۔ ”بھائیو مسلمانو! پاکستان ہم نے اپنا خون دسے کر حاصل کیا ہے۔ درجب ہم اس پاک سرزمین پر قدم رکھنے والے ہیں۔ ہم اپنے خالق سے یہ عہد کریں کہ ہم پاکستان کی حفاظت کے لیے تن من و دھن کی باری لگا دیں گے۔ مسلمانو! پاکستان تم سے ایماں کی عاقبت کا مطالبہ کرتا ہے۔ ایثار و قربانی کا جذبہ طلب کرتا ہے۔ تم پاکستان کا مطالبہ پورا کرو غازیوں کی زندگی جیو اور شہیدوں کی موت مرد۔ یاد رکھو کہ ہمیں ایک مرتبہ اس طرف پھر پلٹنا ہے۔ ہم فوجیں لے کر پائیں گے اور اس قلعہ پر پاکستانی جھنڈا لہرائیں گے۔“

اس آخری فقرے نے بڑا کام کیا۔ لوگوں نے بے تحاشانہ فرے لگانے شروع کر دیئے۔ فیاض خاں سبطین سے کہنے لگا۔ ”یار یہ تمہارا حق کیا کوئی بہروپا ہے؟“

سبطین نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”میں مسلم لگی ہے۔“

”تم کہاں کے رہنے والے ہو گی؟“

”امرتسر کا۔“

”امرتسر تم کر کے آئے تھے یا پیہی آ گئے تھے۔“

”جی کیا بتاؤں جی۔ جب امرتسر میں گولے چھنے لگے تب میں وہاں سے نکلا۔ سارا ماں میر غارت ہو گیا۔ جی کیا بتاؤں۔“ امرتسر

میں میرا بہت بڑا ہو گیا تھا۔ یہاں میں کابک میں بیٹھا ہوں اور پھر بھی الامنٹ والے آ آ کے ٹک کرتے ہیں۔“

فیاض خاں اسے دیر تک ٹھٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ اس نے اس کے چہرے پر کسی گہرے دکھ کی علامت ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی اور آخر اپنی ناکامی پر جھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے خاموشی سے چائے کے پیسے ادا کئے اور دوکان سے باہر نکل آیا۔ اس نے پھر لمبے لمبے ڈگ بھرنے شروع کر دیئے۔ بلکہ شاید اب اس کی رفتار زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ اسے تو عتا غصہ تھا یہ واقعی ایک سوال ہے جس کا جواب آسانی سے نہیں دیا جاسکتا ایک نگلی سے دوسری نگلی میں اور دوسری نگلی سے تیسری نگلی میں وہ یوں داخل ہو رہا تھا۔ گویا بہت جلد اسے کہیں پہنچنا ہے۔ مگر اسے پہنچنا کہاں تھا؟ ایک بوڑھے کباب فروش کو دیکھ کر وہ ٹھٹکا۔ کباب فروش نے فٹ پاتھ پر بجلی کے کھمبے کے برابر اپنی دوکان جمائی تھی۔ کھمبے پر ایک پٹھے کا ٹکڑا لٹکا دیا گیا تھا۔ جس پر کالی روشنائی سے لکھا ہوا تھا۔ "دن کباب وال۔" فیاض خاں فٹ پاتھ پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ "لو۔ بڑے میاں! کباب کھاؤ۔"

"کباب کھاتے کھاتے فیاض خاں نے پوچھا۔" "کبو بڑے میاں خساد کے دنوں میں آئے تھے؟"

"ہاں میاں۔" کباب فروش متا سفاہ لہجہ میں بولا۔ "ساری دلی میں آگ لگ رہی تھی اپنی بھری دوکان چھوڑ کے آیا ہوں۔ سائے سیفیں رکھی تھیں۔ بس انہیں بغل میں مارا اور نکل پڑا۔" کباب فروش آگ جھپکنے لگا۔ پھر آپ ہی آپ کہنے لگا۔ "میاں بہت بڑی دوکان تھی میری۔ یہاں کیا ہے سڑک پر بیٹھ ہوں۔"

فیاض خاں اٹھ کھڑا ہوا۔ "بوڑھے میاں اپنے پیسے۔" اور آگے چل پڑا پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا۔ ہر ڈگ کے بعد اس کی رفتار زیادہ تیز ہوتی جاتی تھی۔ وہ کس سڑک پر سے گزر رہا تھا۔ اس کا شاید اسے احساس نہیں تھا۔ اب عالم میں کئی سڑکوں اور گلیوں کے احساس سے بری ہو جاتا تھا۔ دوکانیں اور دوکانوں کے بڑے بڑے پورڈ سامنے آئے اور گزر گئے تاکوں سائیکلوں اور موٹروں کے شور میں وہ اپنے آپ کو گم ہوتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ ایک دوکانوں کے ہجوم میں وہ بہا چلا جا رہا تھا۔ اس کا تکی چاہا کہ یہ ہجوم بڑھتا چلا جائے اور پھر بے تکی شادہ دوزخا شروع کر دے پھر اتنا شور ہو کہ کانوں کے پردے پھٹ جائیں اور اس رستا خیر میں وہ گم ہو جائے کھو جائے۔ اس نے کئی ایک مرتبہ غیر واضح طور پر یہ خواہش بھی محسوس کی کہ ایک ایسا کی زمین اس زور سے بٹے کہ یہ ساری بلند و بالا عمارتیں ڈاڑھ اٹھ کر کے نیچے آ گریں اور ساری چیزیں اونچے ہو جائیں اس نے اور برق رفتاری سے چلنا شروع کر دیا۔ کئی ایک فحشوں سے اس کی تادستہ طور پر ٹکرائی۔ ایک دو آدمیوں کو اس نے جان بوجھ کر کندھا مارا۔ اس نے یہ دیکھنے کی زحمت کو رائی کی کہ اس کی اس روش کا ان پر کیا رد عمل ہوا۔ ادھر ادھر دیکھے بغیر وہ آگے بڑھے چلا گیا۔ پھر اچانک اس نے اپنے آپ کو ایک مختلف لفظ میں پایا۔ یہاں نہ تاکوں اور موٹروں کا شور تھا نہ راگبیروں کا ہجوم تھا۔ اکا دکا راگبیروں کا ایک فراغت کے احساس کے ساتھ چلتے

پھرتے دکھائی دے رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی سائیکل سوار آہستہ آہستہ سائیکل چلاتا نظر آتا اور اطمینان سے گزارا چلا جاتا۔ ایک دوکان پر پیٹھے کا ترشا ہو ایک قد آدم یا بوکھڑا مسکرا رہا تھا۔ جس کے چٹون اور کوٹ کا ایک ایک گوشہ پوری نفاست سے دکھایا گیا تھا اس کے نیچے لکھا تھا۔ ”اپنا سوٹ یہاں سلوائے“ چند قدم کے فاصلہ پر ایک ہواڑی کی دوکان نظر آئی جس پر چند آدمی بیٹھے باتیں گھوٹ رہے تھے۔ ہواڑی کی دوکان دیکھ کر اس نے سگرت کی طلب محسوس کی۔ اس نے بڑھ کر سگرت کا پیکٹ نکالا۔ دوکان کے پتھر پہ ایک شخص سینہ کبھ رہا تھا۔ ”اماں مجھے تو پہلے ہی پتہ چل گیا تھا کہ حملہ ہونے والا ہے۔ سامان باندھ بوندھ گھروالوں کو لے نکل پڑا۔ بس یہاں یہ سمجھو کہ اس نے بڑی خیریت کی۔ ادھر میں شیش پنپچا اور ادھر وہاں حملہ ہو گیا۔“ فیاض خاں نے اسے گھور کے دیکھا اور پھر سگرت کے پیسے دکر کے آگے بڑھ گیا۔ اس خاموش اور پرسکون گلی میں اس نے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس کیا۔ اس کا پی چاہا کہ وہ کسی ایسی سڑک پہنچے۔ جہاں کھوئے سے کھوا چھلکا ہوا اور تانگوں، موٹروں اور سائیکلوں کے شور سے کان پڑی ”وڑستانی نہ دے۔ وہ پھر برق رفتاری سے چلنے لگا۔ گلی کے کنارے پر ایک مزدور سے اس کی بری طرح ٹکر ہوئی۔ مزدور نے ترخ کر کہا۔ ”مہار سانسے دیکھ کر چلا کر دے۔“ اس نے اس بات کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔ اور اپنی رفتار میں کسی قسم کی تبدیلی کئے بغیر آگے بڑھ گیا۔ مختلف پتلی پتلی گلیوں اور پرہجوم سڑکوں کو عبور کرنے کے بعد اس نے اپنے آپ کو ایک وسیع اور ٹویل سڑک پر مڑتے ہوئے محسوس کیا۔ یہاں نہ سوار یوں کا شور و غل تھا۔ نہ دوکانوں کی دور وید قطاریں تھیں۔ گھنے سایہ دار درخت دور تک دور وید صفیں باندھے کھڑے تھے۔ کبھی کبھی کوئی بس گزری چلی جاتی اور اس کے گزر جانے کے بعد پھر خاموشی پھیل جاتی۔ یہ درخت کچھ یوں کہتے نظر آتے تھے کہ یہ خود پھر کا شور کیا حقیقت رکھتا ہے۔ ہم نے بڑے بڑے ہنگامے دیکھے ہیں۔ ہر ہنگامہ بالآخر ایک جاوڑا سکوت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ فیاض خاں بدستور پیسے پیسے ڈگ بھر رہا تھا۔ اب اسے اپنے قدموں کی چاپ صاف سنائی دے رہی تھی اور پہنے دس کے دھڑکنے کی آواز بھی۔ راوی کے ہل پر پہنچ کر وہ ٹھٹھکا۔ ایک لمحہ کے لیے اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ ہل پر کھڑے ہو کر دریا میں چھلانگ لگا دے۔ مگر یہ خیال جلد ہی زائل ہو گیا۔ اسے اس بات سے الجھلا بیٹ ہونے لگی کہ یہ دریا اتنی ست روی سے کیوں بہہ رہا ہے اس میں ایک امنگ پیدا ہوئی کہ دریا کی بہر میں بلند ہوتی چلی جائیں اور سمندروں کے شور کے ساتھ ہل کے اوپر سے پہنچے لگیں اور پھر منہم ہوا کر پانی میں بیٹھ جائے۔ پھر خود بخود اس کے قدم اٹھ گئے اور وہ آگے بڑھ گیا۔ درختوں کے سائے اب کچھ دور گہرے وہ گئے تھے۔ اس پر فضا سڑک پہ سے گزرتا ہوا وہ بالآخر مقبرہ جہاں گہر میں جا پہنچا۔ آم کے ایک درخت کے نیچے ٹھنڈی ٹھنڈی گھاٹاں پر وہ ٹھک کر بیٹ گیا۔ یہاں بیٹ کر اس نے پہلی مرتبہ واضح انداز میں سوچا کہ آخر لوگ افسوس کرنے کی باتوں پر افسوس کیوں نہیں کرتے۔ پھر وہ

تقرآ میز لہجہ میں بڑ بڑایا۔ ”شہر تباہ ہو گئے اچھ ہو۔“ اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

وہ رات فیاض خاں کے مقبرہ جہاں تکسیر ہی میں گزاری۔

ان دنوں فیاض خاں کی کثر راتیں کھلی فضا میں بسر ہوئیں۔ منزل نے سر سے سینہ پٹھا کہ میرے گھر رہو۔ مگر فیاض خاں جب ایک مرتبہ انکار کر دیتا تھا تو پھر وہ انکار اقرار میں نہیں بدلتا تھا۔ چنانچہ اس کی نہیں نہیں ہی رہی۔ منزل کے سارے دلائل اور ساری التجاؤں کا جواب اب بس اس نے ایک ہی دیا ”نہیں“ اس کے پاؤں میں چکر تھا۔ یا کوئی ایسی چیز تھی۔ جو سے قرار بیٹے نہیں دیتی تھی کسی جگہ نکلنے نہیں دیتی تھی۔ ہر فضا اور ہر ماحول میں اسے خفقان ہوتا اور وہ بے تابا نہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتا۔ کبھی وہ شہر کے ہنگامہ خیز اور پر ہجوم بازاروں میں گھومتا نظر آتا۔ کبھی شہر سے باہر کی خاموش سڑکوں پر زمین کا گر بنا دکھائی دیتا۔ اکثر وہ مہاجرین کے کیمپوں کے چکر کاٹتا بھی دیکھ گیا تھا۔ مہاجرین میں وہ ایک خاص قسم کا رد عمل دیکھنا چاہتا تھا اور جب یہ رد عمل اسے نظر نہ آتا تو سے مہاجرین پر جھنجھٹا ہٹ ہونے لگی۔ پھر اس نے مقامی لوگوں میں ایک مخصوص قسم کے رد عمل کی جستجو کی۔ یہاں بھی اسے ناکامی ہوئی اس کے مزاج کا پارہ اور چڑھ گیا۔ اس کے لہجہ میں کچھ اور تلخی پیدا ہو گئی اور اس کی حرکات و سکنات میں ایسی تندہی اور شدت پیدا ہو گئی۔ جو عام طور پر انتہائی مایوسی کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔

منزل نے اس کے ساتھ تنہی ہوے کی بہت کوشش کی۔ لیکن اس نے ہر موقع پر اور ہر قدم پر اس کی حوصلہ شکنی کی۔ کبھی کہتا۔ ”میں میں کھوتو نہیں گاؤں گا اور کھو گاؤں۔ تو ڈھنڈورا پٹا رہا۔“ مگر منزل خاصا مستقل مزاج نکلا۔ وہ اس قسم کے سارے فقرے ساری جھڑکیاں پی پی گیا۔ لیکن وہ کیسے کر سکتا تھا کہ چوبیس گھنٹے اسے آنکھوں سے اچھل ہی نہ ہونے دے۔ منزل کی نگاہ جب بھی چوکی اور گھنڈ ڈیڑھ گھنڈ کے لیے جب بھی وہ اس سے جدا ہوا فیاض خاں ایسا غائب ہوا کہ تین تین چار چاروں تک اس کا پتہ نہیں چلا۔ گھومتا گھومتا وہ خود ہی کسی روز چائیک بھٹین کے گھر آ ن پکتا۔ یوں رفتہ رفتہ بھٹین کا گھر اس کی مستقل قیام گاہ بن گیا۔ دراصل اسے منزل سے زیادہ بھٹین سمجھتا تھا۔ اس نے نہ تو اس کے ساتھ گھنٹے کی کوشش کی اور نہ گھر پہ ٹھہرنے کی دعوت دی۔ اخبار کی تجویز کا اس نے اس سے ضرور ذکر کیا۔ سو اس کی اس نے بڑی شدت سے مخالفت کی۔ اس کا استدلال یہ تھا کہ اخبار نہیں چلے گا۔

بھٹین نے تاؤ میں آ کر کہا۔ ”چلنے نہ چلنے کا ذکر کیوں کرتے ہو۔ ہم پر چون کی دوکان نہیں کھول رہے ہیں۔ اس کا مقصد تو قوم کے ضمیر کو بیدار کرنا ہے۔“

فیاض خاں تڑخ کر بولا۔ ”قوم کا ضمیر ہے کہیں۔ بیدار کسے کرو گے؟“

فیاض خاں کی مخالفت پہ کوئی وحین نہیں دیا گیا۔ سبطین اور منزل دونوں قوم سے بہت پر امید تھے۔ سبطین کے گرداب پھر حوائین کا گروہ جمع ہوتا جا رہا تھا۔ منزل کے ساتھ لاہور کے ایک اور جو شیے طالب علم اجمل نے سبطین کے یہاں آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ جب خبر کی تجویز نے زیادہ زور پکڑا تو یہ دونوں منچلے سبطین کی بیٹھک ہی میں آ پڑے۔ منزل کو دعا دیجئے کہ اس نے ایک اچھے خاصے بڑے مکان کا قبضہ سبطین کو دے دیا تھا۔ سبطین نے اخبار کی جو سیکم سب سے پہلے تیار کی۔ وہ بڑی جامع تھی۔ مگر اس میں روپے پیسے کا ذکر لکھ کر نہیں تھا۔ یہ بات سے حق صاحب کے یاد دلانے پہ یاد آئی۔ یہ مشورہ بھی حق صاحب ہی کا تھا۔ کہ چند بے کے یہ دیرانگیر کے سامنے ہاتھ پھینک دینے کی ضرورت نہیں ہے شہر کے چند ایک رئیسوں سے مل لیجئے وہ ضرور مدد کریں گے۔ "خیر یہ فرض حق صاحب ہی نے ادا کیا کہ وہ سبطین کو مختلف رئیسوں سے ملانے کے لیے لے گئے۔ جس سے بقوں کے ان کی گاڑی چھنی تھی۔ اس قسم کی ملاقاتوں کے بعد ہمیشہ یہ دیکھا گیا کہ سبطین پان کی گھوری کلمے میں رکھے اکیلا گھر لوگا۔ منزل کی باز پرس کا ہمیشہ یہ جواب دیا گیا کہ "وہ آدمی تو تواضع کے ہیں۔ مگر حق صاحب نے مصلحتاً ہماری تحریک کا ذکر مناسب نہ سمجھا۔ پھر کسی دن جائیں گے۔" آخر اس توجہ سے خود سبطین کو کتاہٹ ہونے لگی اور اس نے ایک مرتبہ پھر مسلمان رئیسوں کے اخلاقی رویوں کو اپنا محبوب موضوع قرار دیا۔ حق صاحب کا بھی اب اس مشغلہ سے دل بھر چکا تھا۔ شاید موضوع کی تبدیلی وہ بھی چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک روز آ کر سبطین کو اطلاع دی کہ ایک پریس کے الائنٹ کا مسئلہ درپیش ہے۔ انہوں نے یہ بھی یقین دلایا تھا کہ الائنٹ السرمیر ادا قاتی ہے۔ اس خبر سے سوکھے دہانوں میں پانی پڑ گیا۔ سبطین نے ایک مرتبہ پھر پھریری لی اور اللہ کا نام لے کر پریس کے لیے درخواست دی۔ اس کے بعد درود و سوپ شروع ہوئی۔ دفتر کے برکھڑک کی میز پہ دستک دی گئی اور ہر اسر سے مذاقات کی گئی۔ البتہ اس اسر کا پتہ نہ چلا۔ جس سے حق صاحب کی علیک سلیک تھی۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ حق صاحب اس ساری مہم میں سبطین کے ہمراہ رہے۔ اس مہم کا خاتمہ بالآخر یوں ہو کہ وہ پریس ایک مہاجر وھوئی کوالات ہوا۔ سبطین نے جب بہت ہائے توبہ بھائی تو اسے ایک لائڈری الاٹ کر دی گئی۔ سبطین یوں بھی مطمئن تھا کہ اس آمدنی سے اخبار چلایا جاسکتا ہے مگر ایک مگریر اس کے پیچھے پڑ گیا در بڑے افسردہوں تک یہ بات پہنچا دی کہ سبطین کو اس کام سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا اور سبطین نے یہ کمال کیا کہ وقت مقررہ پر لائڈری کا قبضہ لینے نہیں پہنچا۔ یوں آئی چیز اس کے ہاتھ سے اٹھ گئی۔

اس ناکامی کے بعد سبطین کے شاگردوں میں حق صاحب کے خلاف ایک عام رد عمل شروع ہو گیا۔ صرف ایک سبطین نے ان کی نیت پر شبہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ لیکن نمبردار صاحب اس قسم کی بدنامیوں سے بچے ہوئے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے

سبٹین کے اخبار کے اوق و شوق اور مسلسل ناکامیوں کو دیکھ کر ایک رجسٹرڈ کمپنی بنانے کی تجویز پیش کی تو کسی طرف سے ن پہ شہر کا اظہار نہیں کیا گیا۔ نمبردار صاحب کو خود ان معاملات کا تجربہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے دو دن میں رجسٹرڈ کمپنی کا سارے خاکہ تیار کر ڈال۔ اس کے بعد جسے بیچنے کی مہم کا آغاز ہوا۔ نمبردار صاحب نے سبٹین کو اطمینان دلایا کہ بہت سے صاحب استطاعت لوگ ان کے جاننے والے ہیں اور وہ ن کے کہنے سننے سے جسے خرید لیں گے اور یہ بات انہوں نے سچ ثابت کر دکھائی کاغذ پہ متعدد نام لکھے گئے۔ اور نمبردار صاحب جس کے پاس پہنچے اس نے حصہ خرید لیا۔ یوں کاغذ بچا کس ہزار روپیہ جمع ہو گیا۔ جس سے ایک روز نامہ با آسانی جاری کیا جاسکتا تھا۔ بلکہ ایک کھاڑی نے دوسروں پہ فوراً اد بھی کر دیئے۔ اس دوسروں پہ کے روز پر دفتر کی سرگرمیاں زار شور سے شروع ہو گئیں۔ سبٹین نے اپنے اخبار والے سے کہہ دیا کہ اردو اور انگریزی کے سارے روزانہ اخبار دے جایا کرو۔ چنانچہ روز دس ہارو اخبار آتے۔ سبٹین بڑے انہماک سے سارے اخباروں کے ادارے پڑھتا۔ خاص خاص سطروں پہ سرخ پینسل سے نشان لگاتا اور ہم سیاسی مضامین کے تراشے کاٹ کر رکھتا۔ اخباروں کے باقاعدہ فائل بننے شروع ہو گئے۔ خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تحریک کے پرانے ہمدردوں کو خط ڈالے گئے۔ تحریک کے ہمدرد اہل قلم کو قلم سنبھال لینے کی ہدایت کی گئی۔ سیشنری بھی خرید لی گئی۔ بس یہ انتھار تھا کہ باقی رقم وصول ہو تو بڑا سامان منگایا جائے اور باقاعدہ اخبار کے اجرا کا کام شروع کیا جائے۔ دن گزرتے گئے اور دو سو روپے کی گنتی کم ہوتی گئی۔ مزید رقم موصول نہیں ہوئی۔ نمبردار صاحب اور سبٹین صبح ہی صبح تقاضے کرنے نکلے اور شام کو نام کام واپس آ جاتے۔ جمل درجزل یا دہانی کے لیے جاتے اور منہ لٹکائے لوتے۔ رفتہ رفتہ دوسروں پہ ختم ہو گئے۔ مزید رقم وصول نہیں ہوئی اور ایک دن سبٹین نے اپنے اخبار والے سے کہہ دیا کہ ”بھئی کل سے اخبارات مت لانا۔ بس ایک اخبار جو پہلے آیا کرتے تھے ڈال جایا کرو۔“

آخر منزل اور اہمل نے ملے کیا کہ روز نامہ نکالنے کی توفیق تو ہمیں کبھی نہ ہوگی نہ نو من تیل ہوگا نہ ادا حانا ہمیں کی۔ بہتر یہ ہے کہ بات اہل روزہ پر سچے شروع کی جائے بعد کو اسے ہی روز نامہ بتالیں گے اور اس کے لیے جتنے سرمائے کی ضرورت ہے۔ وہ با آسانی جمع کیا جاسکتا ہے۔ غرض یوں منزل اور اہمل نے کمر بخت باندھی اور طلبا اور چھوٹے موٹے آدمیوں سے چند جمع کرنا شروع کر دیا۔ منزل اور اہمل نے جس تندہی سے چند جمع کیا تھا اس تندہی سے اخبار کا ڈیٹنگریشن حاصل کیا اور سارے انتظامات درست کئے یہ دونوں شخص دس بھر پر بس اور کاجوں کے گھروں کے چکر لگاتے ڈاک لاتے اور کاروباری خطوط کا جواب دیتے۔ ٹیکٹوں سے بات چیت کرتے، خریداروں کے سوانح کے جواب دیتے، پرچہ پوسٹ کرتے اور چٹھک کے قلم پر اپنی خاک کی لمبھیں دھونے سبٹین

سارے دن لکھتا۔ ایڈیٹر اذیت کی ڈاک کا کالم خبروں کی تحفیں خبروں پر تبصرہ غرض یہ ہفت روزہ اخبار شروع سے آخر تک سبٹین کے قلم کار ہون منت ہوتا۔ مگر نہ محنت مشقت کام آئی نہ خلوص سے بات مٹی۔ ہر تبصرہ اپنی پڑی۔ اخبار کو نہ چھٹا تھا نہ چلا۔ چندہ رفتہ رفتہ ختم ہونے لگا اور ایک دن وہ آیا کہ پریس کی اجرت ادا کرنے کی غرض سے محل کو اپنے کورس کی ساری کتابیں یکمشت لگا دینی پڑیں۔ دوسری مرتبہ اس محل کو اجمل نے دہرایا۔ مگر اخبار کی حالت یوں کب سنبھلتی تھی۔ پرچہ بک، سٹال پہ بیسے جاتے وہاں وہ ہفتوں رکھے رہتے ورا آخر خاک میں ات کر اپنے اصل مقام پہ واپس آ جاتے۔ کسی خریدار کے پاس پیسے بہت فالتو ہوئے تو اس نے پرچہ خرید لیا اور نہ عام طور پر یہی ہوا کہ دیکھنے والے نے پرچہ اٹھایا۔ الٹا پلٹا اور رکھ دیا۔ حق صاحب نے ایک روز راز راہ ہمدردی یہ بتایا کہ پرچے کی چیلٹی اچھی ہوئی دوسرے دن سبٹین نے اوصار قرض سے اشتہار چھپوائے اور اجمل اور محل نے خود جا کے اشتہاروں کو لوگوں میں تقسیم کیا۔ در دیاروں پہ چپکا یا مگر تیرہویں ڈھاک کے تئیں پات رہا۔ پھر جب اشتہارات کی کمی کی طرف اشارہ کیا گیا۔ تو محل اپنے اثر و رسوخ سے دوڑ حائی اشتہار بھی جھپٹ لایا۔ مگر پرچے کی تقدیر میں تو ڈوبنا لکھا تھا۔ کسی طرح نہ تر۔ پرچہ کسی طرح نہ تر اور قوم کا ضمیر کسی صورت بیدار نہ ہوا۔

ایک روز جب فیاض خاں وہی تو اسی گھر واپس آیا تو دیکھتا ہے کہ کمرے کی بجلی غائب ہے۔ اس کی بھائے ایک موسم بلی جل رہی ہے۔

”کیوں بجلی کو لکھا ہوا؟“

”سٹ گئی۔“ محل نے جواب دیا۔

”کیوں؟“

”بل کے تین سو روپے کس گھر سے آتے؟“ سبٹین بولا۔

”مگر تمہارا اخبار کا کام کیسے ہو، کرے گا؟“

سبٹین حسرت آمیز لہجہ میں بولا۔ ”وہ کام اب ختم ہو گیا۔“

فیاض خاں نے چونکا مطلق ضروری نہ سمجھا۔ اطمینان سے بولا۔ ”خیر وہ کام تو ختم ہونا ہی تھا۔ مجھے تمہاری فکر ہے۔ تمہارا وقت اب کیسے گزرا کرے گا۔“

اس طنز کا کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ فیاض خاں نے جوتے کے تسمے کھولے اور چادر میں منہ لپیٹ کر خزانے میں لگا۔

سبطین کا گھر خاصی سرے بنا ہوا تھا۔ مردانے کے بڑے کمرے میں سبطین فیاض خاں منزل اور اجمل کے بستر بچے ہوئے تھے۔ حق صاحب بھی کافی دن تک یہاں جسے رہے۔ حمید ذاکیر کو بھی شروع میں یہیں پناہ لینی پڑی تھی۔ رنیا کی کوفٹری میں صحن اور کائے خاں نے مستقل طور پر قیام کر رکھا تھا۔ عین کو کوئی دوکان الٹ نہ ہو سکی۔ لیکن راجو میں موسیقی بے تحاشا ذبح ہو رہے تھے۔ صحن نے بھی جتنی لنگا میں ہاتھ دھوئے اور سچ کے کہاب بنانے شروع کر دیئے۔ زمانے میں بوجی کے کمرے میں افسری نے بھی قیام کر رکھا تھا۔ ایک دوسرا چھوٹا سا کمرہ اور تھا۔ جس میں بلو اور نوابین نے بستر بچھا لیے۔ کوفٹری میں بوجی نے پناہ مان بھر دیا تھا۔ اس پے گلشن کو بھی اسی کمرے میں بسیر کرنا پڑا۔ اسی کمرے میں بلو کے بچے ہوا اور اسی کمرے میں نوابین کے طوطے نے انتقال کیا۔ نوابین کی یہ بڑی خواہش تھی کہ اس کے طوطے کی قبر کسی نیم کے درخت کے نیچے بنے لیکن جب اردو پڑوس میں کہیں نیم نظر نہ آیا تو اس نے صحن کے ایک کونے میں اسے داب دیا۔ بوجی کا کمرہ مردانے کے بالکل برابر تھا۔ افسری کے رنگ دھنک کا نہیں پتہ ہی نہیں چلا گلشن کا تھا ضرور ٹھنکا تھا اور اس نے بوجی سے اس کا ذکر بھی کر دیا تھا۔ مگر بوجی نے تو افسری کو بتائی بتایا تھا۔ وہ اب اس کے خلاف کسی شہ کو دل میں کیسے جگہ دے سکتی تھیں۔ مردانے میں اور کسی کو تو نہیں مگر فیاض خاں کو ضرور حق صاحب کی حرکات و سکنات پر شبہ گزرا تھا ایک دو مرتبہ اس نے ان پر فقرہ بازی بھی کی۔ لیکن حق صاحب سارے فخرے شربت کے گھونٹ کی طرح پی گئے۔ حق صاحب بھی سمجھتے ہوں گے کہ فیاض خاں خوش ہے۔ گھنڈ دو گھنڈ کو گھرا آتا ہے۔ اسے جس طرح بھی ہوتا ہے رہا۔ انہوں نے ہنگامے کا آغاز کرتے وقت بھی یہ دیکھ لیا تھا۔ کہ فیاض خاں گھر میں نہیں ہے سبطین کو ان کی روش بہت گراں گزری مگر وہ جو شل ہے کہ جب دوپہا دہن راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ افسری میں کچھ ایسی گرجوشی تو واقعی نہیں تھی مگر اسے انکار بھی نہیں ہوا اور بوجی نے افسری کو واقعی اس شان سے رخصت کیا جیسے بیٹی رخصت کرتے ہیں۔

تیسرے دن جب فیاض خاں گھر میں گھس تو سبطین نے اسے اطلاع دی کہ حق صاحب کو ایک کارخانہ الاٹ ہو گیا ہے اور وہ یہاں سے منتقل ہو گئے ہیں۔ فیاض خاں نے بڑی بے تکلفی سے کہا۔ ”خس کم جہاں پاک“ مگر جب اسے یہ بتایا گیا کہ افسری بھی اس کے ساتھ گئی تو اس کا دل دھک سے رو گیا۔ فیاض خاں اپنے بوٹ کے قسے کھول رہا تھا۔ اس کا ہاتھ رک گیا۔ کب ڈر سکتے کے بعد اس نے قسے پھر کس لیے اور بغیر کچھ کہے سے باہر نکل گیا۔

فیاض خاں نے وہ رات سڑکوں پہ گھوم کر گزاری۔

افسری کے نکاح کے واقعہ پر بڑی چہ میگوئی ہوئیں۔ نکاح اچانک ہوا۔ کسی کو سان گمان بھی نہ تھا کہ افسری حق صاحب سے بھی

بیایا جاسکتی ہے۔ اس میں ان بیبیوں کی واقعی بڑی کرکری ہوئی۔ جو اڑتی چڑیا کو پکڑتی ہیں اور جن کے کان پتے کے کھڑکنے پہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انہیں اس واقعہ کی ہوا بھی نہیں لگی۔ سب کو عین وقت پر پہنچا۔ شاید اس ناکامی کے احساس نے اس واقعہ کو درہمیت دے دی۔ بلکہ اس واقعہ کے بعد ریل گاڑی کے بہت سے چھوٹے چھوٹے واقعات یاد آئے۔ ان کی معنویت اس پہا ب روشن ہوئی اور اس نے ہر واقعہ کو بار بار ساری تفصیلات کے ساتھ سنایا۔ لیکن نمبردارنی اس واقعہ کی ابتدا ہجرت سے بہت پہلے سے بتاتی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ رشید کی زندگی میں ہی افسری اور حق صاحب میں آشنائی ہو چکی تھی۔ نو بن نے نمبردارنی کے اس خیال کی ہر موقع پر تائید کی اور اس کے ثبوت میں رشید اور افسری کی مسلسل ان بن کا ذکر بھی بار بار کیا۔ نمبردارنی نے یہ بات نمبردار کے حوالہ سے کہی کے حق صاحب ہر وقت سبھین کی دھنک میں پڑے رہتے تھے اور اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ افسری سے تاک جھانک کی جائے۔ انہوں نے رشید کی موت پر اس کے رد عمل کا بھی ذکر نکالا اور کہا۔ ”اری خصم مر اتودہ ایک دن بھی بیٹھ کے نہ روئی اور کوئی ہوتی تو جیسے اس کا سہاگ لانا تھا تو وہ تو سر بھی نہ اٹھاتی۔“

نو بن نے اس پہ کھڑا لگایا۔ ”امی اس نے تو خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو اچھا ہوا چھٹکارا اٹھا۔ بابی بی اس مرد سے تو اس کا دل ہی نہ ملا۔“
 یو بولی۔ ”مگر وہ مرد بڑا جھنٹی تھا۔ اس نے اس کا ہاتھوں میں دل رکھا اور کوئی ہوتی تو ایسے میاں کے بھر دھو دھو کے پتی۔“
 نمبردارنی کہنے لگیں۔ ”امی وہ عورتیں اور ہوتیں ہیں۔ یہ اچھا ل چکا تو میاں کو خاطر میں نہ لائی۔ اس کا تو دیدہ چہنا ہوا تھا۔“
 یو بحث کو سینٹے ہوئے بولی۔ ”خیر بی بی وہ غریب تو اپنی جان سے گیا۔ اب یہ کچھ ہی کیا کرے۔“

افسری نے ان باتوں کا مطلق اثر قبول نہیں کیا۔ اس نے نہ تو بیبیوں کی تہمت طرازیوں کا رد قبول کیا اور نہ حق صاحب کے جوش و خروش کا اثر قبول کیا۔ حق صاحب نے بڑے چاڑ سے یہ بیاد رکھا تھا۔ پاکستان آنے کے بعد جن چیزوں نے انہیں قنوطیت سے نجات دلائی۔ ان میں ایک تو کارخانہ تھا اور دوسری افسری تھی۔ یوں پاکستان آنے ہی وہ پھر مسلم لگی بن گئے تھے۔ مگر انہیں اس بات کی بڑی شکایت تھی کہ جن لوگوں نے پاکستان کی جدوجہد میں حصہ لیا اور اس کی خاطر اپنا تن من و دھن نہادیا۔ انہیں اب دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا گیا ہے۔ پاکستان کے سلسلہ میں انہوں نے خود جو جو قربانیاں دی تھیں۔ اس کا بھی انہیں احساس تھا۔ انہوں نے بار بار لوگوں پہ یہ جتایا تھا کہ انتخابات کے سلسلہ میں وہ گاؤں گاؤں مارے پھرے اور حسن پور کے سارے ہندوان کی جاں کے دشمن ہو گئے۔ بلکہ ان کی وکالت بھی اس چکر میں تھپ ہو گئی مگر پاکستان کی دشمن میں انہوں نے اپنی جان کو جاں نہ سمجھا اور اس کے لیے ہر طرح کی قربانی دی۔ اس کے علاوہ انہیں اور بھی چھوٹی چھوٹی شکایتیں تھیں۔ ایک انہیں یہ بھی شکایت تھی کہ پاکستان میں برسات

ڈھنگ سے نہیں ہوتی۔ لیکن جب ایک مرتبہ موسلا دھار بارش ہوئی اور ایک سڑک پہ چلتے چلتے ان کا پاؤں پھسل گیا تو پھر انہیں پاکستان کی سڑکوں سے شکایت پیدا ہو گئی جب انہیں کارخانہ الاٹ ہو گیا تو اس کی یہ ساری شکایتیں رفع ہو گئیں۔ اگرچہ یہ حساس انہیں پھر بھی رہا کہ انہوں نے پاکستان کے لیے جتنی قربانیاں دی تھیں ان کا انہیں قرار واقعی اجر نہیں ملے۔ تھوڑی بہت جو کسرباتی روگنی تھی۔ سے افسری کے نکاح نے رفع کیا۔ اس کے چند دن تک بسطین کی بیٹھک میں ان کی صورت مطلق نظر نہ آئی۔ لیکن جب افسری اپنی بے نیازی پر بدستور ڈٹی رہی اور مختلف موقعوں پر حق صاحب کو بری طرح جھڑکیاں کھائی پڑیں تو انہوں نے رفتہ رفتہ پھر بسطین کے یہاں "نا شروع کر دیا اور ایک مرتبہ پھر انہوں نے بسطین کی ہر تجویز پر بے سوچے سمجھے آمنا و صدا قائم کرنے کا شعار اختیار کیا۔

رفتہ رفتہ افسری کی سرد مہری کے قصے عام ہونے شروع ہوئے۔ حق صاحب جو نکاح کے فوراً بعد کے زمانہ میں نکلے تصور کئے گئے تھے یکا یک سب کی بھر دیوں کے مستحق بن گئے۔ بوٹی کی ساری بھر دیاں پہلے افسری کے ساتھ تھیں۔ مگر چونکہ اب اس نے ان کے یہاں آنا جانا بہت کم کر دیا تھا۔ اس لیے وہ بھی اب اس سے کچھ فرٹ ہو گئی تھیں۔ اس لیے ان واقعات پر تبصرہ کرنے کے لیے ہلو اور لواہن کو نمبردارنی کے گھر جانے کی زحمت گوارا نہیں کرنی پڑی۔ خود جب نمبردارنی وہاں آئیں تو انہوں نے یہ قصہ بھیڑ دیا۔ لواہن نے نمبردارنی کے کان میں خاصی دیر تک باتیں کیں۔ آخر اس نے ذرا آوار بلند کی۔ "اری میا۔ وہ خصم کو تو منہ ہی نہیں لگاتی۔ بات بات پہ جھڑکیاں دے رہے ہیں۔"

اب ہلو کو بھی بولنے کا حق حاصل ہو گیا۔ "اجی کیا پوچھو ہو۔ خصم غریب کی تو جان ضیق میں ہے۔ وہ ہاتھ باندھے کھڑا ہو رہا ہے۔" "نیگم یہ کھاؤ۔ نیگم یہ لو۔ نیگم یہ کرو۔" اور نیگم کے قصے میں گرم مصالحوں۔ اس سے بات نہیں کرتی کسی بات پہ گردو ہوں پڑے ہے تو وہ کہتے کی سی ٹانگ یوے ہے کہ خدا کی پتا۔"

نمبردارنی بویں۔ "بی بی بچ پوچھو تو اس عورت کا دیدہ پھٹ گیا ہے۔ گھر والی عورتوں کے تو اس کے عور ہی نہیں۔" لواہن نے جو نتیجہ اخذ کیا۔ وہ زیادہ جسارت آمیز تھا۔ "میا میری یہ بات لکھ لو۔ یہ اس مرد سے لگ کے نہیں بیٹھے گی۔" اس فقرے نے بوٹی کو بہت چونکایا۔ انہوں نے براہ راست افسری کی خدمت مناسب نہ سمجھی۔ صرف اتنا کہا۔ "تو بہ تو بہ بر زمانہ آیا ہے۔ ہم نے اپنے زمانے میں ایسی باتیں کاہے کوئی تھیں۔"

یہ اس پہ چمک کر بولی۔ "بوٹی یہ چودھویں صدی ہے۔ اس زمانے میں جو نہ ہو تھوڑا ہے۔" بوٹی کو زمانہ پہ بہت غصہ آیا۔ "اس زمانے کا تختہ لوٹنے۔ اس میں کیا کیا ہوگا۔ گھر اوجڑ گئے۔ دی کٹ مر گئے۔ اس کینٹ کو صبر

ہی نہیں آتا۔“

بوجی کے اس فقرے نے بحث کو دوسری طرف موڑ دیا اور اس لیے گلشن کو اب ان کے پاس بیٹھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ آج کل گلشن پہ انگریزی کچھ زیادہ ہی مہربان تھی۔ اس بے گلشن بھی اسے اطلاعات پہنچانے میں نفل نہیں ہرتی تھی۔ البتہ فیاض خاں کے متعلق جب کبھی انگریزی نے اس سے کچھ پوچھا تو اس کے کان ضرور کھڑے ہوئے مگر وہ اس پوچھ بچھ کی لم کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکی۔

کئی ماہ تک غلے کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوسکا۔ اس کی دوکان کیا چھٹی وہ اچھا خاصا گھن چکر بن گیا۔ اس کے مطابقت کچھ بہت لمبے چوڑے نہیں تھے۔ سے ایک مپھوٹی سی دوکان کی تلاش تھی جہاں وہ تھوڑا بہت سودا خرید کر سہا لے اور اپنی کھوٹی ہوئی دوکان کی یہ دتارہ کرے۔ مگر اس کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی۔

وہ خدا سے مانگتا تو شاید کچھ مل بھی جاتا۔ خدا ہمیشہ سبھی کبھی بھی ضرور اپنے بندوں پر رحم کھاتا ہے۔ مگر اس نے محکمہ بحالیات سے دوکان مانگی تھی۔ محکمہ بحالیات والوں کا حال یہ ہو رہا تھا کہ نہ ان کے قہر کا ٹھیک تھا نہ مہر کا۔ عداوت اور ٹکڑوں کا انہوں نے وہ اعجاز دکھایا کہ اگلے پچھلے سارے ریکارڈ مات ہو گئے۔ جس پہ مہربان ہوئے اس کا منہ موتیوں سے بھر دیا۔ جنہیں عنایت کا مستحق نہ سمجھا۔ انہوں نے الامنٹ کے دفاتروں کی دلیجز کی خاک نہ چھوڑی اور پھر بھی پیا سے ہی لوٹے۔ عین پہ ایک مرتبہ عنایت ہوئی تھی۔ مگر عجب انداز سے۔ اس نے اپنے پارے میں درخواست میں لکھا تو یہی تھا کہ وہ حسن پور میں پھاڑی کی دوکان کرتا تھا۔ رامنٹ والوں نے اس کے حال پہ کمال مہربانی کی کہ ایک انگریزی دواخانہ اس کے نام الاٹ کر دیا۔ اس پہ ایک مہاجر کپاؤ نڈر نے بہت شور مچایا۔ عین بھی اس سبب ڈھب عنایت سے کچھ خوش نہ تھا۔ مہاجر کپاؤ نڈر کے شور مچانے پہ محکمہ کی سمجھ میں یہ تو آ گیا کہ انگریزی دواخانہ عین کے نام الاٹ نہیں ہونا چاہیے۔ مگر اس کے بعد وہ اس مہاجر کپاؤ نڈر کو نہیں بلکہ ایک پرچونے کو الاٹ ہوا۔ بہر حال عین اس جھک جھک سے بچ گیا۔ اس کے بعد اس نے بہت دوڑ دھوپ کی اور ایک ایک کلرک کی ہتھ جوڑی کی۔ مگر پھر اس کی قسمت ٹس سے مس نہ ہوئی۔ رامنٹ والوں سے مایوس ہو کر عین نے اپنے طور پہ دوکان حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ دوکان نہ ملنی نہ ملی۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ بساط خانے کا سامان گاڑی پہ رکھ کے بچا جائے۔ اس کے پاس رکھا کیا تھا جو یہ سامان خریدنا تلاش اور بے سہار مہاجرین کے لیے اس زمانے میں ایک ہی بیوپار رکھتا ہوا تھا اور وہ تھا کیا بوں کا بیوپار۔ لہٰذا وہ درمیان میں مویشی دھڑ دھڑوڑا ہوا ہے تھے۔ جس کسی کو کوئی صورت نظر نہ آئی۔ اس نے بڑے کا تھوڑا سا گوشت خریدنا لٹ پاتھ پہ چوہا گرم کیا اور کہا ب بنانے شروع کر دیئے۔ عین جب ہر طرف سے مایوس ہوا تو وہ بھی آخر اسی طرف متوجہ ہوا۔ لہٰذا بازار سے چھ سات سیخیں خریدیں۔ ایک دوکاندار

اسے اس کے ہتھ پر بیٹھنے کا معاہدہ کیا اور حرے سے کہا اب بیچنے شروع کر دیئے۔ یہی ہتھ پال آخر عین رُفیا اور کالے خاں کی ٹھیک بن گیا مگر اس ٹھیک کو وہ حیثیت حاصل نہ ہو سکی جو حسن پور کی دوکان کو حاصل تھی۔ اب وہ لوگ کہاں تھے۔ جس کی عین کی دوکان پہ دھنک جما کرتی تھی اور جہاں بیٹھ کر رُفیا کا تخیل بے گام ہو جاتا تھا اور کالے خاں کی موٹھیں تن حاتی تھیں۔ اور عین کا ہلوں خون بڑھتا تھا۔ سامنے سڑک پر بے سرو سامان پریشاں حال مہاجروں کی ٹولیاں کی ٹولیاں نظر آتیں اور گزر جاتیں۔ ہر قماش کا۔ دی چلا دکھائی دیتا۔ ہر رنگ کی صورت نظر آتی اور رُفیا عین اور کالے خاں چپ چاپ بیٹھے رہتے۔ ان کی دو فقرہ باریاں وہ قہقہے دو گپ بازیاں یوں ختم ہوئی تھیں۔ گویا وہ ان سے کبھی آشنائی نہ تھے۔ دراصل تینوں ہی اب کچھ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہو گئے تھے۔ کالے خاں نے پشاور جمنٹ کے واقعات سنانے چھوڑ دیئے تھے۔ اب اسے بہت دنوں سے یہ بتانے کی بھی ضرورت پیش آئی تھی کہ وہ واقعی پلٹن ہے۔ خیر کالے خاں یوں بھی ایسا توئی نہیں تھا۔ تعجب تو رُفیا پہ ہے جس کی زبان کبھی تالو سے لگتی ہی نہیں تھی اور جو ایک ایک اشارے سے ایک ایک داستان تیار کرتا تھا آخرا سے کیا ہو گیا تھا۔ اس کے تخیل کی وزن کہاں چلی گئی تھی۔ اب تو وہ یوں خاموش بیٹھا رہتا تھا گویا اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ دلی کا تذکرہ بھی ختم تھا اور اخبار کی خبریں بھی معرض بحث میں نہیں آتی تھیں۔ سپوہاں کا ذکر ہوتا لیکن بس ضرورت کے مطابق۔ عین رُفیا کالے خاں تینوں کم متحان بنے بیٹھے رہتے۔ عین خاموشی سے کہا ب سینکڑا رہتا۔ کوئی گاہک آ کر کہا ب مانگتا۔ عین چپ چاپ سٹخوں سے طشتری میں کہا ب اتار تا ان پر پیاز چھڑکتا چٹنی ڈالتا اور گاہک کے حوالے کرتا۔ گاہک کہا ب کھا کر پیسے ادا کرتا اور آگے بڑھ جاتا اور عین پھر اوجھنے لگتا۔ اس کے چہرے پہ ایک سی افسردگی اور اضمحلال نظر آتا تھا جو اس سے پہلے کبھی اس کے چہرے پہ نہیں دیکھا گیا تھا۔ افسردگی خاں کے چہرے پہ بھی نظر آتی تھی۔ لیکن اس افسردگی میں ایک اضطراب ایک بے چینی کی کیفیت بھی ملی نظر آتی تھی۔ اسے دیکھ کر اکثر یہ شبہ گزرتا کہ اس کی کوئی چیز کھو گئی ہے اور وہ اسے ڈھونڈ لینے کے لیے جتا ب ہے۔ عین کے برابر وہ گم سم بیٹھا رہتا سڑک پہ چلتی ہوئی بھیڑ سے بے غرض کہا بوں کی خوشبو سے بے نیاز۔ اور وہ بکا یک چونک اٹھا۔ "ابے عین۔"

عین لا پرواہی سے "ہوں" کہتا اور آگ کو چٹکھا کرنے لگتا۔

کالے خاں پوچھتا۔ "یار کیا شیردج مچ کر گیا؟"

رُفیا ان الفاظ پہاچا چونک اٹھا۔ پہلے وہ کالے خاں کو دیکھتا۔ پھر اس کی سوالیہ نگاہیں عین کے چہرے پہ جم جاتیں۔

عین کا ہاتھ ڈھیلا پڑ جاتا۔ لیکن وہ آگ کو بدستور چٹکھاتے جاتا۔ وہ تھوڑی دیر خاموش رہتا اور پھر آہستہ سے بڑے افسردگی

آميز لہجہ میں جواب دیتا۔ ”ہاں سہی گیا۔“

پھر خاموشی چھا جاتی۔ علس انگاروں کو تیزی سے پکھا کرنے لگتا۔ رفیا کا سر جھک جاتا کالے خاں کھٹکلی ہاتھ کر خد میں گھورنے لگتا۔

کالے خاں اس قسم کے بے تکے سوال اکثر کرتا اور خود بخود مطمئن ہو جاتا۔ علس کی دوکان پر وہ بیٹھا رہتا۔ بیٹھا رہتا اور پھر ایک ساتھ وہاں سے اٹھتا اور بعد مرنہ اٹھتا چل پڑتا۔ جب دور کسی سنان سڑک پہ نکل جاتا تو اس کی کچھ میں نہ تا کہ آخروہ کس مقصد سے ادھر آ یا ہے۔ وہ چلتا اور پھر علس کی دوکان پہ خاموش جا بیٹھتا۔ اس کی کچھ میں اب اپنی اکثر باتیں نہیں آتی تھیں اور اب باتیں بھی کچھ اس قسم کی کرنے لگا تھا جو اس نے پہلے کبھی نہیں کی تھیں۔ جس پر اس میں وہ کبھی سبھین کے پاس جا کر نہیں بیٹھا۔ علس کبھی سبھین کو اس وقت بھی عام لوگوں سے مائل قائم کرنے اور انہیں اپنی تحریک کے زیر اثر لانے کی دھن تھی۔ لیکن اب وہ سبھین کے پاس جا کر بیٹھا اور گھنٹوں اس کی باتیں سنیں۔ اس نے بڑے غصوں اور دیانتداری سے سبھین کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ مگر وہ کچھ نہ سمجھا۔ منزل نے اپنی طرف سے بہت کوشش کی کہ کالے خاں بھڑکنے نہ پائے۔ اسے قطعی امید تھی کہ وہ تحریک کا بڑا مفید اور سرگرم بلکہ سرفروش رکن بن سکتا ہے۔ مگر کالے خاں کو رفتہ رفتہ وہاں بیٹھنے سے خفقان ہونے لگا۔ آخروہ رستہ ترک کر بھاگ ہی نکلا۔ ایک مرتبہ لنگنے کے بعد دوبارہ اس نے منزل کی بات پہ کان نہیں دھر اور پھر کبھی اس طرف کا رخ نہیں کیا۔ مگر سکون اسے وطن کی دوکان پہ بھی حاصل نہ ہوا۔ اس کی کچھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ آخر پہلے علس ور دیا کی صحبت اس کے لیے کیوں آسودگی کا سامان مہیا کرتی تھی ورنہ اب کیوں اسے اس دوکان سے وحشت ہوتی ہے۔ وہ یہ بھی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ آخر اس آشفستہ سری اس اضطراب کا اصل سبب کیا ہے اور اس کا سدباب کیونکر ہو سکتا ہے۔ یہ اضطراب محض باطنی نہیں تھا۔ اس نے اپنے ظاہری اطوار میں بھی اک تہذیبی عسوس کی تھی اور تو اس کا دل کھٹکے پر جا رہا تھا۔ جس لطف سے وہ علس کی ہاسی گزدہانیاں کھایا کرتا تھا اور چٹنوں کی پھٹکیاں مارا کرتا تھا۔ اس لطف سے وہ اس کے بنائے ہوئے کہاب کبھی نہ کھا سکا۔ ایک مرتبہ تو اس نے علس سے کہا بھی دیا۔ ”یار یہ تیرے کہاب تو بالکل سنسنے سنسنے ہو رہے ہیں۔“

علس نے جواب دیا۔ ”تو یہاں سے چٹنی ملا لیا کر۔“

اس پہ کالے خاں نے کہا۔ ”یار تیری چٹنی بھی کھا س ہو رہے ہیں۔“

علس کھسپا کر بولا۔ ”تو بھیا تو اپنے منہ کا علاج کر۔“

ایک منہ پر منحصر نہیں۔ اس کے سارے جسم کا یہی حال تھا۔ آخروہ علاج کیسے کرتا اور کیا کرتا۔ اس کا پورا جسم ٹوٹا ہوا سا معلوم

ہوتا اور اس کا جی چاہتا کہ وہ اسے کسی سخت سی چیز سے ٹکرائے کبھی کبھی اس میں یہ خواہش شدت سے جاگ اٹھتی کہ وہ کسی طوفان خیز سمندر کی بلند ہوتی ہوئی موجوں میں چلا تک لگا دے اور پوری قوت سے ان سے ٹرے۔ کبھی وہ اس پہ نائل ہوتا کہ بھڑکتی ہوئی لگ میں کود پڑے اور یا تو اس میں خود جل کر بھسم ہو جائے یا اپنے زور سے اس آگ کو بجھا دے اسے اکثر حس پور کے آخری دن بھی یاد آتے تھے اور اس یاد کے ساتھ وہ انگاروں پہ لوٹے لگتا۔ ایسے موقعوں پر اسے حق صاحب اور نمبردار صاحب پر بہت غصہ آیا ہے۔ وہ اکثر ان کے ناموں کے ساتھ گلیوں کے سامنے استدس کر کے یہ شکایت کرتا تھا کہ انہوں نے مقابلہ نہیں ہونے دیا اور وقت سے پہلے بھاگ چھپے۔ اب اس ایک غلطی کی حکائی کیسے کی جائے۔ یہ بات اس کی بکھ میں نہ آتی تھی ورنہ اس کا خوں اندر ہی اندر کھول کر رو جاتا تھا۔ سبیلین کو وہ حق صاحب اور نمبردار صاحب کی صف میں تو شمار نہیں کرتا تھا۔ لیکن اس سے بھی وہ کچھ ایسا خوش نہیں تھا۔ ایک مرتبہ اس نے رفیق سے کہہ ہی دیا۔ ”ابے دنیا یہ تیرے سپو میاں جو ہیں یہ کس یونگی ہیں۔“

رفیق اس بات پہ بہت تپا۔ ”بات کیا ہے ہے؟“

”بات کچھ بھی نہیں۔“ کالے خاں بولا۔ ”جس کیو آگھا اور دل گا دے ہیں۔ میرے پٹے تو کچھ پڑتا نہیں۔“

رفیق ابور۔ ”یہ تو دن کی بات کیا سمجھے گا۔ پڑھوں نکھوں کی بات ہے دے اور تو ہے لٹھ۔“

”نہیں ہے۔“ کالے خاں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”وے تو بالکل تیری طریقوں میں بازی کریں ہیں۔“

رفیق اس فقرے پہ بہت سرد ہوا۔ کالے خاں نے اسے جواب کا موقع نہیں دیا۔ کہے لگا۔ ”یار میں تو پہ کوں ہوں کہ بس دھت

تیری کی اور دھت تیری کی لٹھ گز اور منے ٹھکانا۔“

رفیق نے بھن کر کہا۔ ”تو یہ دے کشمیر چلا جا۔ واں خوب بنا رئی اسے۔ تیرے دل کے سارے ارباں نکل جاویں گے۔“

کالے خاں یہ فقرہ سن کر دم بخود رہ گیا۔ عین نے سچ پہ قہر چڑھانا شروع کر دیا اور رفیق آگ بجھنے لگا۔

کالے خاں تھوڑی دیر بالکل خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اچانک ایک بہت آہستہ سے وہ وہاں سے اٹھا اور ایک طرف کو ہولیا۔

رات کو جب رفیق اور عین اپنی کوٹھری میں پہنچے تو اس کے تقریباً دو گھنٹے بعد کالے خاں گھر لوٹا۔ رات اس کی خاصی بے چینی سے

گزری۔ رفیق تو خیر بے خبر سوتا تھا۔ لیکن عین کی جب آنکھ کھلی اس نے کالے خاں کو کمر میں بدلتے پایا۔ ایک مرتبہ اس نے ٹوکا بھی۔

”بے کالے خاں کیا بات ہے؟“

کالے خاں نے جواب دیا۔ ”بچہ نیند نہیں آتی۔“ اور یہ کہہ کے دوسری طرف کروٹ لے لی۔

صبح کو کالے خاں نے علان کیا کہ ”یار میں چڑی جا رہا ہوں۔“

رفیا و وطن دونوں خاموشی سے اسے دیکھنے لگے۔ علس نے پوچھا۔ ”کیوں؟“

”داں سے کشمیر جاؤں گا۔“

رفیا و وطن دونوں کی نگاہیں اس کے چہرے پہ جم گئیں۔

آخر رفیا ہوا۔ ”پر سبھیوں کو کہہ رہے تھے کہ کشمیر میں لڑائی بند ہو چکی اے۔“

کالے خاں نے فوراً جواب دیا۔ ”یار میں جھوٹ نہیں کہتا۔ یہ تیرے سہو میاں بیٹھے بیٹھے بس گپ بازی کیا کریں ہیں اور دل سے

کچھ نہیں آتا۔“

اور یہ کہہ کے اس نے اپنا ستر پینٹا شروع کر دیا۔

گلی خاموش ہے۔ کہیں دور سے ایک کتے کے رونے کی آواز آرہی ہے۔ رات گہری ہو چکی ہے۔ اس وقت بارہ کا عمل ہوگا۔

بچے پاس گھڑی تو ہے نہیں۔ جب گھڑی پاس نہ ہو تو پھر فضا کے ستارے اور کتوں کی آوازوں سے ہی وقت کا اندازہ لگانا پڑتا ہے۔

آج میں نے اپنی ڈائری مجب انداز میں شروع کی ہے۔ دن کے سارے ہنگاموں اور سرگرمیوں کو چھوڑ کر میں رات کا ذکر لے

بیٹھا ہوں۔ اور رات کے بھی وہ مجھے صہیں ۱۳ دسمبر کے آخری سانس کہتا چاہیے۔ خیر یہ بات مجھ سے کسی خط تو نہیں ہے۔ رات کے

ستارے سے بڑا ہنگامہ میرے تصور میں نہیں آتا۔ وہیں دن کی سرگرمیاں سو یہ تو ایسی ہی بات ہے کہ آدمی چراغے کر ہوا سے لڑنے

لکے دن کیا دن کے ہنگامے کیا۔ ہر سرگرمی کی جان جمود ہی پر ٹوٹی ہے۔ سارے ہنگامے خاموش ہو جاتے ہیں۔ بس ایک خاموشی کا

ہنگامہ کبھی خاموش نہیں ہوتا۔

دن کے بارے میں کیا لکھوں۔ آج دن میں کوئی ایسی بات ہوئی ہی نہیں۔ جس کا تذکرہ کیا جائے۔ آج کا دن تو تاریخی نہ تھا۔

لیکن آج کی رات ضرور تاریخی ہے۔ ۴۸ء نے لوٹ پیٹ کراہی زندگی کے دن پورے کر دی لیے اس کے پیٹ سے ایک ادھر مر بیچ

پیدا ہوا ہے۔ ۴۹ء! فضا کی نبض ڈوبتی جاتی ہے۔ رات خاموش ہے۔ کشمیر کے محاذ پر بھی اب خاموشی چھا گئی ہوگی۔ جو بھادرین سر پہ

کلتیوں باندھ باندھ کر میدان میں پہنچے تھے۔ انہوں نے اب کھواریں نیاموں میں ڈال لی ہوں گی اور چپ چاپ اپنے خیموں کو

واپس آ رہے ہوں گے۔ میں سوچتا ہوں کہ اس وقت ان پر کیا کیفیت گزر رہی ہوگی۔ جنگ کے خاتمہ پر انہوں نے اطمینان کا سانس یہ ہو

گایا انہوں نے ایک کرب محسوس کیا ہوگا۔ مگر یہ تو جزوی بات ہوئی اصل بات یہ ہے کہ لڑائی ختم ہو گئی۔ رات خاموش ہے۔ فضا کی نبض

ذوق جاتی ہے۔ دور سے کسی اکیسے کتے کے رونے کی آواز برابر آئے چلی جا رہی ہے۔ ہم لوگوں سے تو یہ کتابی زیادہ حساس نکلا۔ کتے آدمی کی نسبت یوں بھی زیادہ حساس ہوتے ہیں اور آدمی بے حس ہو جائے تو پھر وہ اور زیادہ حساس ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ دن کی روشنی میں ان سے زیادہ بے حس اور ذلیل مخلوق کوئی نظر نہیں آتی۔ ان کے حکر کی ساری تپش ان کے دس کا سارا درد کاں راتوں کے سناٹے میں پوری شدت کے ساتھ پنا اظہار کرتا ہے۔ آخر وہ راتوں کو کیوں اتنے درد سے روتے ہیں اور وہ کوئی شے ہے جو ان کے نالوں میں اتنا سوز اُتتا کرب پیدا کر دیتی ہے۔ یہ سوال واقعی غور کرنے کا ہے مگر مجھے نیند آ رہی ہے۔ کیا دماغ ور کیا آنکھیں انسان کے سارے حواس رات کے جادو کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں۔ میری آنکھیں بند ہوتی جا رہی ہیں۔ اب مجھے سو جانا چاہیے۔

فیاض خاں نے ڈائری بند کر کے تکیہ کے نیچے رکھ لی اور چپکے سے عاف میں دبک گیا آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ لیکن جب اس کی کپڑی پہ بھٹی ہوئی تو صرف اس کے ہاتھ نے ہی جنبش نہیں کی۔ بلکہ اور دوسرے اعضاء بھی بیدار ہو گئے۔ اس نے آہستہ سے کراٹ لی اور سگری ہوئی ناگوں کو پھیلایا۔ رفتہ رفتہ اس کی آنکھیں پھر بند ہونے لگیں۔ بلکہ اس مرتبہ تو سے بھٹکی بھی آ گئی تھی۔ لیکن کسی نامعلوم کھٹکے سے اس کی آنکھ پٹ سے مکمل گئی اس نے فوراً ہی پھر آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ مگر ذہن بھی جب بے قابو شے ہے ایسی آہستگی سے آنکھ بچا کر نکلا ہے کہ کانوں کان خبر نہیں ہوتی اور ان بھولے سر سے رستوں پہ چل پڑتا ہے جنہیں حافظہ ہزاروں مس مئی کے نیچے دفن کر چکا ہوتا ہے۔ جانے اسے ان دو پٹھانوں کا خیال کیسے آیا جنہیں اس نے کاندھ سے پہ بندوق رکھے مال روڈ پہ لیے لیے ڈگ بھرتے دیکھا تھا اور جو کشمیر جانے کے لیے سرگرداب پھر رہے تھے اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ان پٹھانوں کی تقریب سے اسے کالے خاں کا خیال آیا۔ ان پٹھانوں اور کالے خاں میں بس ایسا ہی رشتہ تھا جیسا چنڈرا ہے کی اینٹ اور ترانہ کے بانٹ میں ہوتا ہے۔ لیکن تصور پہ کسی کا کیا بس ہے۔ فیاض خاں کو کالے خاں کا خیال آیا اور اسی تقریب سے آیا۔ کالے خاں کا خیال آتے ہی وہ بے ساختہ مسکرا پڑا۔ عجب بہنگم شخص ہے۔ سمجھتا ہے کہ نام کے ساتھ خاں لگانے سے وہ واقعی پٹھان بن جائے گا۔ بھلا نام میں کیا رکھا ہے۔ پٹھانی نام کا نہیں حراج کا نام ہے۔ اب میرا ہی نام ہے اس میں سے میں خاں کا لفظ اڑا دوں تو فرق کیا پڑتا ہے اس خیال کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے نام کے آگے سے خاں کا لفظ واقعی اڑ دیا اور خاں "فیاض" کا تصور کرنا چاہا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ ایک مرغا ہے۔ جس کا کیس یا ایک غائب ہو گیا ہے وہ سوچے گا کہ "خاں" مرغ کا کیس ہوتا ہے۔ کیس اڑا دیجئے۔ مرغ غائب گنجا رہ جاتا۔ کیس مرغوں کی نسلی علامت ہے قومی نشان ہے۔ اس کا خیال بھٹک کر

کسی دوسری طرف جائیگا۔ حدنگاہ تک اونچی نیچی پہاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ مرغوں کا ایک غول ان چونیوں پر حرکت کرتا نظر آ رہا تھا۔ ان کے کیس غائب تھے اور وہ سر نیوڑ ہائے آنکھیں بند کئے چپ چاپ ڈھولانوں پر اترتے چلے جا رہے تھے۔ فیاض خاں نے جسم پہ سے کمرل مٹ دیا۔ تھوڑی دیر تک وہ چپ چاپ لیٹا رہا۔ پھر رفتہ رفتہ اسے سردی لگنے لگی اور وہ ایک ساتھ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بوٹ کے آگے ہاتھ اٹھاپنا سونا کوٹ پہنا اور مچن میں نکل آیا۔ ستارے کچھ مند گئے تھے مند رہے تھے یک بڑے رقبہ میں دھندلے ستاروں کے ادغام سے کچھ ایسی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ گویا کسی قافلہ نے یہاں چوہے روشن کئے تھے۔ وہ قافلہ گزر گیا ہے اور وہ چوہے اب بجھے پڑے ہیں۔ بعض بڑے بڑے ستارے کچھ یوں بے نور ہو گئے تھے۔ گویا روشن آنکھیں یا ایک ہتھرا گئی ہوں۔ البتہ صبح کا ستارہ اب تک جگر جگر چمک رہا تھا۔ در افق پر اندھیرا اور اجالہ کر کچھ سادش کر رہے تھے۔ فیاض خاں مچن سے نکل کر سڑک پر آ گیا اور آگے چل پڑا۔ سڑک خاموش تھی۔ اس خاموش ماحول میں اسے صرف دواؤں کی سٹائی دے رہی تھیں۔ اپنے بھاری بولوں کی آواز اور اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز۔ اس نے اور تیزی سے چلنا شروع کر دیا۔ مختلف سڑکوں سے گزرنے کے بعد وہ ایک طویل طویل سڑک پہ ہوسا۔ نہر کے پل پر پہنچ کر وہ ٹھہرا۔ وہ پھر نہر کی سڑک پہ پڑ لیا رات کی تاریکی دھل چکی تھی۔ لٹ میں ہر طرف ایک لطیف قسم کا سفید دھند چھایا ہو تھا۔ نہر کے پانی پر دور تک سفید فبار منڈلاتا نظر آ رہا تھا۔ فیاض خاں کو پہلے تو یہ نظر رہا۔ مگر پھر اس کی یکسانیت سے اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ وہ سوچنے لگا کہ آخر یہ نہر ہر جگہ ایک سی کیوں ہے۔ اس میں نشیب و فراز اور سچ و خم کیوں نہیں ہیں اور کناروں پر ہر چند قدم کے بعد ایک درخت کیوں آتا ہے۔ کیا یہ درخت قدم باپ کر لگائے گئے ہیں۔ فطرت کا احتیاط پن آفر کہاں گیا۔ آخر ایسا کیوں نہیں ہے کہ پھولوں کے درخت جہاں ہوں وہاں اکٹھے ہوں اور استن ہوں کہ پھولوں کی ڈبیوں کے بوجھ سے پانی کا دم رکھنے لگے۔ اس خیال کے ساتھ ساتھ اس کے قدم سڑک کی دوسری سمت میں مڑنے لگے۔ سڑک سے نیچے دور تک سبزہ پھیلا ہو تھا اور اس سبزے پر کھیرے کی ہلکی دودھیا چادر بچھی ہوئی تھی۔ سڑک سے اتر کر وہ اس سبزے پہ چلنے لگا۔ گھاس کے ایک شاداب کٹڑے پر پہنچ کر وہ رکا۔ اس نے بیٹھ کر بوٹ کے آگے کھولے اور ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پہ پاؤں رکھ دیئے اس نرم اور ٹھنڈی گھاس کے لمس میں اسے کچھ اس قدر رنٹل آیا کہ اس کا بے تحاشا یہ لگی چاہا کہ پورے جسم سے اس لمس کو محسوس کیا جائے وہ زمین پہ پٹ لیٹ گیا اور اپنا منہ شبنم لود گھاس پہ رکھ دیا۔ کئی منٹ تک وہ چپ چاپ لیٹا رہا اور رفتہ رفتہ اسے یوں محسوس ہوا کہ اس کے سینے کے ساتھ ساتھ اس کے سینے کے نیچے واں زمین کا سینہ بھی دھڑک رہا ہے اس نے آسمان پہ بے کیفی اور بے حسی کی جو کیفیت دیکھی تھی۔ اس سے یہ کیفیت بالکل مختلف تھی۔ گھاس برف کی طرح ٹھنڈی تھی۔ مگر اس نرم اور سرد گھاس کے نیچے اس نے حرارت اور حرکت کو

محسوس کیا۔ یہ تجربہ اس کے لیے نیا بھی تھا اور تسلی بخش بھی۔ اس نے اب تک زمین کو اپنے قدموں سے روندنا تھا۔ اس کی نرمی اور
 حرارت کو محسوس نہیں کیا تھا اسے یوں لگا کہ ایک لطیف سے سرد لباس میں ملبوس کوئی نرم گرم چیز اسے اپنی "غوش" میں لئے لے رہی ہے
 اور وہ اس میں گم ہوا جا رہا ہے۔ اس پر ایک شیریں غشی سی چھائی جا رہی ہے۔ یکا یک ایک صفحہ سے کھٹکے سے اس کا دھیان ہٹ گیا۔
 وہ بہت چو لکا تو نہیں مگر آہستہ سے آنکھیں ضرور کھول دیں۔ سورج نکل آیا تھا۔ نرم سنہری شعاعیں گھاس کے گدگدیاں کر رہی تھیں۔
 تھوڑے سے فاصلہ پر کوڑے کے ڈھیر پر جنگلی کبوتروں کا ایک غول اتر آیا تھا اور بڑی سرگرمی سے اس میں سے دانے چک رہا تھا۔
 دانہ چھتے چھتے ان کے سر پر حرکت جسم بار بار اسے قریب آ جاتے کہ بس یوں لگتا کہ زمین پر کسی نے بہت سا سرمہ بکھیر دیا ہے اور اس
 میں برقی بہریں پیدا ہو گئی ہیں۔ پاس ہی کوؤں کی بھی ایک ٹولی منڑ کشیاں کرتی پھرتی تھی۔ کبوتروں کا غول آپ ہی آپ بھرا کھا کے
 اڑ گیا۔ کوؤں کے دس میں نہ جانے کیا سہائی کہ وہ بھی وہاں سے اڑ لئے۔ ایک کوئے کا بازو لٹک گیا تھا اس نے پہلے توڑنے کی کوشش
 کی۔ مگر جب وہ اس کوشش میں ناکام رہا تو بہت دور تک گھاس پہ دوڑنا چلا گیا۔ مگر کوئے دور نکل گئے تھے اور وہ تھک کر پھر پٹکنے لگا۔
 فیاض خاص بہت دیر تک اس پانچ کوئے کو دیکھتا رہا اور رفتہ رفتہ اسے یوں محسوس ہوا کہ خود اس کا بار وہ بھی لٹک گیا ہے۔ کسی غلطی کے قفلہ
 نے اس کا ہانڈ توڑ کر رکھ دیا ہے اور کوؤں کی باقی برادری سے اس کا ناٹھ ٹوٹ چکا ہے۔ اس وقت جھکی ہار اس کے دس میں خیال آیا کہ
 اس نے اپنی زندگی بارودہ ضائع کی ہے۔ اس خیال کے ساتھ ساتھ اس کے مزاج کی درشتی اور شدت سرد پڑ گئی اس کی جگہ ایک افسردہ
 سی کیفیت نے لے لی۔ افسردگی کے ساتھ ساتھ اس خیال نے اور زور پکڑا۔ اس کے جسم کے کسی نامعلوم کونے سے ایک آواز آرہی
 تھی۔ "زندگی ضائع ہو گئی۔ زندگی ضائع ہو گئی۔" پہلے اس نے اس آواز کا گلا دبانے کی کوشش کی۔ اس پر غصہ پانا چاہا۔ لیکن اس آواز
 کا زور بڑھتا گیا۔ اور وہ پسپا ہو کر محسوس ہونے لگا۔ مین اسی عالم میں اسے افسری کا خیال آیا۔ وہ نکلا ہوا پھل جو اس کی گودی میں آگرا
 تھا اور جسے اس نے ٹھکرا دیا تھا۔ کاش وہ وقت پھر واپس آئے اور ایک مرتبہ پھر..... مگر اس خواہش کا گلا اسی آواز نے کھوٹ دیا۔
 جو اس کے جسم کے نامعلوم کونے سے ہند ہو رہی تھی اور جو کہہ رہی تھی۔ "زندگی ضائع ہو گئی۔ وقت بیت گیا۔" اس نے آنکھیں بند کر
 لیں اور دھیان بنانے کی خاطر ایک مرتبہ پھر اس کیفیت کو محسوس کرنا چاہا جس کا وہ تھوڑی دیر پہلے تجربہ کر چکا تھا مگر وہ دھڑکتی ہوئی
 آغوش جو تھوڑی دیر پہلے اسے سمجھنے لینے کے لیے بے تاب تھی۔ اب سٹ گئی تھی۔ زمین کی وہ سوندھی سوندھی خوشبو وہ نرمی وہ حرارت
 غائب ہو چکی تھی۔ ٹھنڈی گھاس پہ لیٹے بیٹے اسے جاڑا لگنے لگا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ اس نے پیروں میں بوٹ ڈالنے ان کے تسمے ہاندھے
 اور اٹھ کر آگے بڑھ گیا۔

وہ بہت دیر تک بے مقصد بے مطلب گھومتا رہا۔ مگر اب اس کی چال میں وہ تندی اور شور باقی نہیں تھا۔ کئی مرتبہ اسے اپنی سست روی پر ہجھلاہٹ ہوئی اور اس نے نیت باندھ کر تیز رفتاری سے چلنا چاہا۔ لیکن کوشش کے باوجود وہ تیز نہ چل سکا۔ اس کی چال میں ایک استغداد کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ دیر تک وہ مختلف سڑکوں کے چکر کاٹتا رہا۔ سنان سڑکوں سے گزر کر وہ آبدلیوں میں پہنچ گیا۔ چلتے چلتے اس نے اچانک اپنے آپ کو حق صاحب کے مکان کے سامنے کھڑا پایا۔ وہ اپنی اس غیر شعوری حرکت پہ حیرت منجھی ہو۔ اور اسے قصہ بھی آیا۔ اس نے وہاں سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کی۔ لیکن دو قدم چل کر اس کے پاؤں پھر رک گئے۔ اسے یوں معلوم ہوا کہ کسی نے اس کے قدم پکڑ لیے ہیں۔ سامنے در پیچے میں ایک سایہ سا نظر آیا اور دھجھل ہو گیا۔ وہ صورت بھی طرح نہیں دیکھ سکا تھا۔ مگر اسے یہ یقین ہو گیا کہ وہ افسری تھی اور اس خیال کے ساتھ ساتھ اس کا دل دھڑکنے لگا کہ کہیں اس نے اس حال میں اسے دیکھ تو نہیں لیا ہے۔ محض گفت مٹانے کی غرض سے اس نے جلدی سے بڑھ کر دروازے پہ دستک دے دی۔ تھوڑی دیر میں نوکرانی نکل کر آئی در پر چھنے لگی۔ "کون ہے جی؟"

لباض خاں نے مختصر سا جواب دیا۔ "کہو کہ لباض خاں آیا ہے۔"

تو نوکرانی اندر گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی اور دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔ "ذکیل صاحب گھر پہ نہیں ہیں۔ بیگم صاحب کہتی ہیں کہ جب وہ آئیں گے تو آپ کا نام بتادیں گے۔"

لباض خاں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ کسی نے کیا کیا اس کے جسم کی روح سلب کر لی تھی۔ کئی منٹ تک وہ بالکل گم سم کھڑا رہا۔ پھر رفتہ رفتہ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور وہاں سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

خبردار بند ہو جانے کے بعد سبھین پر کئی دن تک بے بسی کی کیفیت طاری رہی اس پہ نہ تو غم کا ایسا دورہ پڑا جو حسن پور میں "انقلاب" کے بند ہونے پر پڑ تھا اور نہ اس نے قصہ کی ضرورت محسوس کی۔ اسے بس یوں معلوم ہوا کہ کوئی چیز کھو گئی ہے۔ ٹوٹ گئی ہے۔ جس کا دوبارہ حاصل ہونا مشکل ہے۔ ملال اور افسردگی کی اک گہری کیفیت نے اسے آدھو چا۔ اس کیفیت نے چند دنوں کے لیے اس کی سوچ کو بھی معطل کر دیا۔ اس نے کئی مرتبہ اس حادثے پر واضح طور پر سوچنے کی کوشش کی۔ مگر ہر مرتبہ اس کی آنکھوں میں تر مرے ناچنے لگے اور ذہن میں خاک سی بھر گئی۔ چیزوں کا وجود اس کی نظروں میں دھندلا گیا تھا اور اسے ہم طور پر یوں محسوس ہوتا تھا کہ دنیا خالی ہو گئی ہے۔ ایک خلا کا احساس تھا جو اس کے عقل و ہوش پر چھا گیا تھا۔ شاید اس کی دنیا میں اب دن، رات بھی باقی نہیں رہے تھے۔ وہ دن میں کسی وقت بھی چادر تان کر لیٹ جاتا اور مٹانے لگتا۔ دو سو تار ہٹا سوتا رہتا۔ یہاں تک کہ رات ہو جاتی۔

پھر کسی وقت رات گئے۔ وہ اٹھ بیٹھتا اور صحن میں ٹہلتا اور سارے وہ کام کرتا جو دن سے مخصوص ہیں۔ منزل جمل اور فیاض خاں کو دیکھ کر کبھی کبھی گمان گزرتا کہ یہ اجنبی لوگ ہیں اور اس سے ملنے آئے ہیں۔

پھر رفتہ رفتہ یہ بے حسی کی کیفیت ختم ہوئی۔ اس کے ذہن کی دھندلاہٹ مٹنے لگی۔ اور چیزوں کی شکلیں اس کی نگاہ میں واضح ہوتی گئیں۔ بے حسی اور ابہام کی جب یہ کیفیت ختم ہو چکی تو سوچ بچار کی وہ پرانی عادت پھر عود کر آئی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر شدت سے سوچنا شروع کیا کہ خبر کا بند ہو جانا کیا معنی رکھتا ہے اور اس کے دوبارہ اجرا کی کیا صورت ہو سکتی ہے وہ ساری سکیم مرتب کر لیتا اور ساری چیزیں بنھاتا چلا جاتا۔ مگر آخر میں سوال پیچ کا اٹھ کھڑا ہوتا اور ساری غمارت نیچے آ گرتی۔ وہ پیچے کا مسئلہ کبھی حل نہ کر سکا۔ اس کے لیے اس نے حق صاحب اور نمبردار صاحب پر ٹکیا کیا تھا اور یہ دونوں بزرگ باتوں سے سونے کے محل کھڑے کرتے تھے اور محل کے موقعہ پر صاف کئی کاٹ جاتے تھے۔ سبھٹین چونکہ باتوں کا بادشاہ تھا۔ اس لیے وہ ان ہوائی قلعوں کو غلوں حقائق کے برابر بلکہ ان سے زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ مگر اب اس آخری شکست نے دن ہوائی قلعوں کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ سبھٹین کو اب یہ جرات نہیں پڑتی تھی کہ پیچے کے سوال کو بالائے طاق رکھ کر کوئی منصوبہ بنائے۔ اس نے اس مسئلہ پر بھی بہت سوچ بچار کیا کہ آخر قوم اسے چندہ کیوں نہیں دیتی۔ اس سوں پر سوچتے ہوئے سے اپنی ذات پر بھی بار بار شک گزرا۔ اسے پہلے تو اپنے غلوں پر شبہ ہوا۔ اسے یقین تھا کہ مسلمان عوام کی جہلت ہمیشہ راسخی پر ہوتی ہے۔ وہ جب کسی کو سر آٹکھوں پہ بٹھاتے ہیں۔ تب بھی راسخی پر ہوتے ہیں اور جب کسی کے گلے میں لعنت کا طوق ڈالتے ہیں۔ تب بھی راسخی پر ہوتے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک رہنما غلوں قلب اور نیک نیت کے ساتھ نہ کے پاس جائے اور وہ اس کی راہ میں آنکھیں نہ بچھائیں۔ مگر جب اس نے غلوں کو چندے کے سوال سے متعلق کر کے سوچنا شروع کیا تو اسے اپنے عقیدت کی غمارت بے منتظر نظر آنے لگی۔ کیا وہ سارے رہنما جو ہر تقریر پہ اپنا دامن بھر لیتے ہیں پر غلوں ہوتے ہیں۔ کیا قوم جنہیں چندہ دیتی ہے۔ وہ ہمیشہ اس جا جائز خرچ کرتے ہیں۔ فیاض خاں ہوتا تو یہ کہتا کہ یہ سب احمق ساری کا کھیل ہے۔ قوم اپنے رہنماؤں کو، احمق بنانا چاہتی ہے اور رہنما اپنی قوم کو احمق بنانا چاہتے ہیں۔ دونوں میں سے جس کا بس چل جاتا ہے۔ سینے پہ چڑھ بیٹھتا ہے۔ مگر سبھٹین ایسی بیڈھب تو جیہات کا قائل نہیں تھا اس نے اس پورے سوال کو گورکھ دھند ابھ کر چھوڑ دیا اور پھر دوسرے ہی پہلو سے مسئلہ پر غور کرنا شروع کیا۔

اخبار کے دوبارہ اجراء کی جب صورت نظر نہ آئی تو پھر سبھٹین نے تحریک کو دوسرے طریقوں سے چلانے کے امکانات پر غور شروع کیا۔ کئی تجویزیں اس کے ذہن میں آئیں اور انہیں اس نے رد کر دیا۔ ایک یہ تجویز بھی اس کے ذہن میں آئی کہ گاؤں گاؤں

گھوم کر تقریریں کی جائیں اور لوگوں تک اپنی بات پہنچائی جائے مگر پھر اس نے سوچا کہ خانی تقریروں سے کیا ہوتا ہے۔ کوئی ٹھوس کام کرنا چاہیے۔ ٹھوس کام کی تلاش میں اس کا ذہن ایک اور طرف نکل گیا۔ اس نے سوچا کہ ایک درس گاہ قائم کرنی چاہیے۔ اسکی درس گاہ جو یک مدرسہ فکر بن جائے ایک زبردست قومی ادارے کی شکل اختیار کر لے۔ اس سلسلہ میں اس نے گلی پچھلی ساری مسلمان درس گاہوں کے نظام کا جائزہ لے ڈالا۔ موجودہ مسلمان درس گاہوں میں کسی کے نظام نے اسے اہل نہیں کیا۔ کسی کو اس نے مغرب زدہ کہہ کر رد کیا اور کسی کو اس نے دقیانوسی نظام قرار دیا۔ ان درس گاہوں کے متعلق سوچتے سوچتے اس کا دہس ”شائق تکتین“ کی طرف رجوع ہو گیا۔ اس کے نظام نے سے بہت متاثر کیا۔ اسے اس پہ ایک ہی اعتراض تھا کہ اس کی فف مخصوص طور پر ہندو ذہنیت کی ترجمان ہے۔ اس نے سوچا کہ ایک درس گاہ شائق تکتین کے طرز پر قائم کرنی چاہیے۔ مگر اس کی فف کی بوباس سلامی ہوئی چاہیے۔ اس سے سادھو لکھنے چاہئیں۔ بلکہ بھدین اور عمل کی تعلیم دینے والے مظکرین پیدا ہونے چاہئیں۔

سبطین نے جب منزل اور جمل کے سامنے اپنا منصوبہ پیش کیا تو انہوں نے کچھ ایسی گرجوٹی سے اس کا استقبال نہیں کیا۔ اب تک تو ان کی روش یہی رہی تھی کہ جب سبطین پھریری لیتا تو وہ بھی پھریری لیتے اور جب سبطین افسردہ ہوتا تو وہ بھی افسردہ ہو جاتے۔ مگر اس مرتبہ اس کی افسردگی دیر پا ثابت ہوئی۔ اخبار کے بند ہو جانے نے ان میں ناکامی کا ایسا حس پیدا کیا تھا جو یوں فرد ہونے والہ نہ تھا۔ سبطین جب کبھی یہ منصوبہ پیش کرتا تو اس میں امید کی ایک نئی لہر دوڑ جاتی تھی اور یہ ہر اس کے رد گرد بیٹھنے والوں میں بھی گرمی پیدا کر دیتی۔ لیکن آج سبطین پورے جوش و خروش کے ساتھ اپنا منصوبہ بیان کر رہا تھا اور جمل اور منزل چپ تھے۔ ان کے چہروں پہ بدستور ایک افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ سبطین اپنا پورا منصوبہ بیان کر چکا۔ وہ بدستور چپ رہے۔ ان کے چہروں پر کسی قسم کی تبدیلی کے آثار پیدا نہیں ہوئے۔

آخر سبطین نے انہیں ٹوکا۔ ”میاں چپ کیوں ہو۔ کچھ بولنا۔“

منزل جمائی لیتے ہوئے بولا۔ ”کیا بولیں؟“

سبطین نے پھر جوش میں آ کر کہا۔ ”اماں بتاؤ نا کہ کیسی سکیم ہے۔“

”بہت اچھی ہے۔“ منزل نے آہستگی سے جواب دیا۔

اجمل نے نکل نکایا۔ ”جی ہے اور بس۔“

”کیا مطلب؟“ سبطین نے چونک کر اجمل کو دیکھا۔

مزل نے جواب دیا۔ ”مطلب یہ ہے کہ یہ محض سکیم ہے۔ ہم اسے عمل میں نہیں لائے۔“

”کیوں نہیں لائے؟“ سبطین کا سچا ورشتہ ہو چلا تھا۔

مزل بے اشتناکی سے ہوا۔ ”بس لائیں گے۔“

سبطین اور گرمایا۔ ”بس لائیں گے۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اگر عزم ہو تو کیا کچھ نہیں کیا جاسکتا۔“

مزل نے اسی سرد مہری سے جواب دیا۔ ”عزم ہو تو سب کچھ کیا جاسکتا ہے۔ مگر ہم اس کے بل پر ایک ہفتہ وار پرچہ نہیں چلا

سکتے۔“

سبطین نے اسی جوش سے جواب دیا۔ ”ہماری ایک چھوٹی سی ناکامی سے اصول نہیں ٹوٹ سکتا۔“

”مگر ہماری چھوٹی چھوٹی بہت سی ناکامیوں سے ایک اور اصول قائم ہوتا ہے۔“

”وہ کیا؟“

”وہ یہ کہ۔“ مزل ایک لمحہ کے لیے رکا اور پھر بولا۔ ”خالی عزم محض ایک ڈھکوسلا ہے۔“

فیاض خاں رضائی تانے خاموش بیٹھا تھا۔ اس نے اب تک اپنی کسی حرکت سے یہ ثابت نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ جاگ رہا ہے۔

مزل کے آخری فقرے پر اس نے کبیل کا ایک کونہ الٹا۔ وہ چند لمحوں تک غور سے مزل کو دیکھتا رہا اور پھر اس نے کبیل میں سر ڈھک

یا۔

سبطین بھی اب خاموش ہو گیا تھا۔ اس کی ٹکا میں سامنے والی دیوار پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر رفتہ رفتہ اس کی ٹھوڑی اس کے گھٹنوں پر

آگئی۔ ٹھوڑی دیر وہ یوں گھٹنوں پہ ٹھوڑی ٹکائے کسی گہری سوج میں ڈوبا رہا۔ پھر اس نے گھٹنوں میں سر دے لیا نہ جانے وہ کتنی دیر

یوں گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا رہا۔ کسر پڑی مسلسل آواز پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اجمل اور مزل ہنا سمان سمیٹ رہے تھے۔ وہ

دن کی لقل و حرکت خاموشی سے دیکھتا رہا۔ انہیں ٹوکنے کی اسے جرات نہ ہوئی۔ فیاض خاں کے کبیل کا کونہ ایک مرتبہ پھر اٹھا۔ دو ڈیڑھ

دومنٹ تک چپ چاپ اجمل اور مزل کو دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ ”مزل اس وقت یہ کیا کر رہے ہو؟“

مزل نے خشکی آواز میں جواب دیا۔ ”بات یہ ہے کہ ہم سوچتے ہیں کہ“ مزل رکا اور پھر بولا۔ ”ہم سوچتے ہیں کہ ہم کچھ نہیں

کر سکتے اور گر کچھ نہیں کر سکتے تو وقت خواہ مخواہ ضائع۔“ مزل غور پورا نہ کر سکا۔

فیاض خاں اجمل سے مخاطب ہو۔ ”اجمل تم بھی؟“

اجمل نے سر جھکا کر جواب دیا۔ ”جی۔“

فیاض خاں گلشنی ہندھے منزل اور اجمل کے چہروں کو دیکھتا رہا۔ پھر اس کی نگاہیں خلا میں جم گئیں۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی تھی۔ شام ہو چلی تھی۔ چھپٹے کا وقت تھا۔ دھند لکا آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا اور چیزوں کے خدو حال دھندلے پڑتے جا رہے تھے۔ ہانپھٹتے جا رہے تھے۔ ہلکے پوری فصاحت کوئی دیکھ کر یہ گمان گزرتا تھا کہ وہ پھل رسی ہے۔ دور کی کسی مسجد سے اذان کی آواز دھنستی رہتی ہے۔ یوں آ رہی تھی جیسے کوئی تھکا ہارا مسافر دو قدم چلتا ہے اور تھک کر بیٹھ جاتا ہے۔ اذان کی آواز کبھی کبھی در تیز ہو جاتی اور پھر مدھم ہو جاتی اور تکی مدھم ہوتی کہ اسے ہوا کی لہریں سامنے تک پہنچنے سے پہلے جذب کر لیتیں۔ منزل اور اجمل نے ہستہ کاندھے پر رکھے ہاتھوں میں صندلیاں سنبھالنے خاموشی سے سبٹین اور فیاض خاں کو سلام کیا اور سر نیچا کر آہستہ سے باہر نکل گئے۔ فیاض خاں اور سبٹین توڑی دیر تک خاموش انہیں جاتے ہوئے دیکھتے رہے اور جب وہ نگاہوں سے اجمل ہو گئے تو فیاض خاں نے کمرے میں منہ پھینک دیا اور سبٹین نے گلشنوں میں سر دے دیا۔

شام کے سائے اور گہرے ہو گئے۔ گلشن لائینس جلد کر لائی اور سنول پر رکھتے ہوئے بولی۔ ”سپو میاں کھانا لے آؤ۔“

”لے آؤ۔“ اس نے گلشنوں سے سرائیٹھانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

گلشن بولی۔ ”پروے منزل میاں اور اجمل میاں جنیں کدھر چلے گئے۔“

سبٹین گلشنوں میں سر دے دے دے بول ”وہ گئے۔“

”گئے؟ کس گئے؟“ گلشن کے کان کھڑے ہوئے۔

”وہ گئے۔ کھانا لے آؤ۔“ سبٹین کا سر بدستور گلشنوں میں تھا۔

گلشن بھونچکی رہ گئی۔ اس نے پہلے بڑی حیرت سے سبٹین کو دیکھا۔ پھر فیاض خاں کی چار پائی پر نظر ڈالی اور پھر دبے پاؤں باہر نکل گئی۔

گلشن جب کھانا لے کر آئی تو سبٹین نے گلشنوں سے سرائیٹھایا اور فیاض خاں کو آواز دی۔ ”فیاض خاں کھانا کھا لو۔“ فیاض خاں خاموشی سے اٹھا، کھلی کی ہاتھ دھوئے اور کھانے پر ڈٹ گیا۔ وہ خوالے آج بھی بڑے بڑے لے رہا تھا۔ لیکن جس تیزی سے وہ نوالوں پر نوالے کھایا کرتا تھا۔ وہ تیزی آج غائب تھی۔ وہ آہستہ سے ایک بڑا سا نوالہ توڑتا شور بے میں ڈیوتا اور منہ میں رکھ لیتا۔ وہ اسے چاٹتا رہتا، چاٹتا رہتا اور جب نوالہ بالکل ختم ہو جاتا۔ پھر دوسرا نوالہ توڑتا۔ کھانے کے دوران میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ دونوں نے

خاموشی سے کھانا کھا یا کٹی کی در پڑ ہے۔

سبٹین کی بیٹھک میں صبح آج کچھ بہت ہی خاموشی سے آئی۔ حزل اور اجمل جو منہ اندھیرے اٹھ کر ساری بیٹھک کی فضا میں جاگ باگ پیدا کر دیتے تھے رخصت ہو چکے تھے فیاض خاں کہاں تو تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر ٹھیلنے لکل جایا کرتا تھا۔ کہاں اب اس نے یہ طور اختیار کیا تھا کہ پوستیوں کی طرح دن چڑھے تک کھل میں منہ لپیٹے پڑا رہتا تھا۔ کمرے میں ایک اداس سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کتے ہیں اور کاغذ ہے تر تہی سے چٹائی پر بکھرے پڑے تھے۔ اجالا پھیلتا جا رہا تھا۔ مگر دھیرے دھیرے اور بہت سہم سہم کر اس احتیاط سے کہ کوئی اس کے قدموں کی آہٹ نہ سن لے۔ مگر سبٹین نے اس کے قدموں کی آہٹ سن لی تھی کئی مرتبہ اس نے منہ کھول کر بھی دیکھا مگر اس اداس جاے سے ڈر کر پھر منہ ڈھک لیا اور فیاض خاں تو شاید ابھی صبح کے وجود کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہی نہ تھا۔ ایک فرطت کے احساس کے ساتھ وہ منہ لپیٹے پڑا تھا۔ اجالا ہوئے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ مگر ایک مرتبہ بھی تو اس نے منہ کھول کر باہر دیکھنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ البتہ جب اخبار والے اخبار ڈال کر گیا تو سبٹین کو چاروں طرف اس نے جاگ اٹھنے کا ثبوت دینا پڑا۔ اخبار پڑھنے کا اس کا وہ اشتیاق آج بالکل ختم ہو چکا تھا۔ پھر بھی وہ رسم کو تو نبھاتی رہا تھا۔ اس نے بیدلی سے خبروں پر نظر ڈالنی شروع کر دی۔ مختلف سرخیوں کو وہ پڑھتا چلا گیا۔ مگر اسے پتہ نہ چل سکا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ کئی ایک سرخیوں پر جب اس نے دوبارہ نظر ڈالی تو اسے احساس ہوا کہ اس نے پہلے انہیں پڑھا ہی نہیں تھا۔ ایک طویل طویل خبر کو وہ بہت غور سے پڑھتا چلا گیا۔ لیکن اسے ختم کر چکنے کے بعد وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ وہ خبر کس بارے میں تھی۔ بعض خبروں کو اس نے جان بوجھ کر نظر انداز کیا۔ ایک سرخی کے لحاظ کے متعلق اسے یوں محسوس ہوا کہ ان کی روشنائی پھیل گئی ہے اور وہ آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ البتہ ایک کونے میں ایک مختصر سی ایک کالمی خبر پر اس کی نظریں ٹھکرائیں۔ اس نے بڑی توجہ سے اسے پڑھا۔

”مظفر آباد۔ ۱۷ جنوری

اطلاعات مظہر ہیں کہ ہندوستانی فوجیں برابر ایسے جارحانہ اقدامات کر رہی ہیں جو معاہدہ ترک جنگ کے خلاف ورزی ہیں۔ آج خبر آئی ہے کہ انہوں نے کل اس قسم کی جارحانہ اقدام پھر کیا اور ایک شخص کو ہلاک کر دیا۔ انہوں نے الزام لگایا ہے کہ یہ شخص ان کے مقبوضہ علاقے میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مقتول کی سیدھی کلائی پر گولہ کا نشان کھدایا ہوا ہے، اور اس کے نیچے اس کا نام ”کالے خاں“ کھدایا ہے۔“

سبٹین کئی منٹ تک بالکل چپ بیٹھا رہا۔ پھر آپ ہی آپ بولا۔ ”لو بھی کالے خاں، را گیا۔“

فیاض خاں نے منہ کھول کر سبطین کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ سبطین نے جواب میں اخبار اس کی طرف بڑھا دیا۔ فیاض خاں نے خبر خود تلاش کر کے پڑھی۔ دوسری خبریں پڑھنے کی اس نے ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس نے خاموشی سے اخبار سرہانے رکھ دیا اور پھر منہ کھیل میں لپیٹ لیا۔

رفیاء جب کمرے میں "یا تو پہلے سبطین اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔" ارے بھئی رفیاء وہ تمہارا کالے خاں تھا نہیں۔

رفیاء چونکا۔ "ہاں جی؟ اس کی کوئی خبر آئی ہے؟"

"ہاں خبر آئی ہے... وہ مارا گیا۔"

رفیاء کی آنکھیں بھٹی کی بھٹی رہ گئیں۔ وہ مجسم سوال بنا سبطین کو دیکھ رہا تھا۔ مگر جب سبطین نے کوئی اور بات نہ کی تو وہ آخر خود ہی بولا۔ "سپو میاں دے تو پھڑکی گیا تھا۔"

"وہاں سے وہ کشمیر چلا گیا۔ وہاں ہمدوستانی فوج نے اس کے گولی مار دی۔"

رفیاء دیر تک بت بنا کھڑا رہا۔ پھر وہ آہستہ سے وہاں سے نکل گیا۔

کوٹھری میں پہنچتے ہی اس نے غلے کو بڑی یاس آمیز آواز میں مخاطب کیا۔ "یا رطلں وہ، کالے خاں،" اس کی آواز رندھ گئی۔

غلے گھبرا یا۔ "کیا ہوا ہے؟"

"کالے خاں مارا گیا۔"

"کالے خاں مارا گیا؟ کون کہوے ہے بے؟"

"سپو میاں... اخبار میں آیا ہے۔"

غلے خاموش ہو گیا۔ پھر بولا۔ "کیا لکھا ہے؟"

"ٹرائی میں گولی لگ گئی۔"

رفیاء کا منہ دوسری طرف ہو گیا۔ غلے کی طرف پیٹھ کئے وہ چپ چاپ دیر تک بیٹھا رہا غلے کی زبان بھی بند تھی۔ پھر وہ بہت آہستہ

سے بولا۔ "میں نے اسے پہلے ہی منع کیا تھا۔"

پھر خاموشی چھا گئی۔ رفیاء غلے سے نگاہ ہچا کر سامنے والی دیوار کو بے معنی طور پر گھور رہا تھا۔ غلے کی نگاہیں غلے میں جمی ہوئی تھیں۔

ان کے جسم بے حس و حرکت ہو چکے تھے۔ ان کی زبانیں سل گئی تھیں۔ دو خاموش بے حس و حرکت سائے!

۱۸ جنوری

کالے خاں مارا گیا۔ اس خبر نے مجھ پہ کچھ عجیب ہی اثر کیا ہے۔ اس شخص کو دیکھ کر مجھے کبھی یہ گمان بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ اس بے جگری سے موت کھا سکتا ہے۔ اس زمانے میں لوگ یا تو اچانک ہیرو بن جاتے ہیں یا پھر میری ہی نظر میں فتور ہے۔ اس شخص کو میں روز دیکھتا تھا۔ اس کی چال ڈھال میں مجھے کبھی کسی غیر معمولی پن کا احساس نہیں ہوا۔ اور ایک روز وہ خاموشی سے میرے پاس سے اٹھا اور موت پر جھپٹ پڑا۔ اس کی موت کی خبر سن کر مجھے آج حضرت علی کا ایک فقرہ رہ رہ کر یاد آیا۔ ”یا تو موت مجھ پہ پھٹ پڑے گی یا میں موت پہ پھٹ پڑوں گا۔“ موت پہ پھٹ پڑنے والے آج بھی موجود تھے۔ بس میں انہیں پہچان نہیں سکا۔ میں یہ سمجھا تھا کہ میرے ارد گرد بے حس اور بزدل لوگوں کا جھوم ہے مگر اس وقت جب موت دلی پہ پھٹ پڑی تھی۔ ایک شخص چپ چاپ میری آنکھوں کے سامنے اٹھا اور موت پہ پھٹ پڑا۔ شیر موت پہ پھٹ پڑا اور کالے خاں گولنداز بن گیا۔ پھر ایک شخص میرے برابر سے اٹھا اور اس نے موت کو جالیا موت کو پچھاڑنے والے موت کو یوں پچھاڑ دیتے ہیں۔ ایک میں ہوں کی عمر بھر موت کو پچھاڑنے کے لیے غم ٹھونکتا رہا اور اب خود میرے پچھڑنے کی نوبت آگئی ہے۔

۱۹ جنوری

آج میں دن بھر منہ لیپٹے پڑا رہا۔ ایک دوسرے میں نے ارادہ بھی کیا۔ کہ ذرا اٹھوں اور باہر گھوم آؤں۔ مگر گھومنا تو درکنار اب تو چار پائی سے اٹھنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ میں اپنے آپ میں ایک عجیب سی نقابت محسوس کر رہا ہوں۔ یہ جسم کی نقابت تو ہرگز نہیں ہے۔ بس مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں جذباتی طور پر تھک کر چور ہو چکا ہوں۔ کچھ عجب عالم ہو گیا ہے۔ اب میں شدت سے کوئی بات محسوس ہی نہیں کر سکتا۔ کل کالے خاں کی موت کی خبر سنی۔ یہ موت بھی دراصل اتنی ہی چولکانے والی تھی جتنی شیر کی موت چولکانے والی تھی۔ مگر میں اسے اس شدت سے محسوس ہی نہیں کر سکا۔ دراصل ہر ہنگامے کی تان ہال آخر جمود ہی پر ٹوٹتی ہے میں نے جیسی ہنگامہ خیز زندگی گزاری ہے۔ اس کا انجام بہر صورت یہی ہونا تھا۔ مجھے اپنی زندگی کی اس شکست کا افسوس نہیں ہے۔ افسوس یہ ہے کہ میں اتنے ہنگامے کے باوجود موت سے ٹکر نہیں لے سکا۔ موت سے جیتنا تو خیر کون ہے۔ شیر وادور کالے خاں بھی اپنے غلطیہ کے باوجود موت سے پچھڑ گئے۔ مگر انہوں نے موت کے دانت ضرور کھڑے کر دیے۔ کچھ اسی شان سے میں بھی موت سے ٹکر لینا چاہتا تھا۔ مگر وہ وقت گزر گیا اور اب میرے جسم میں میری روح میں ایک ٹھکن سرایت کرتی جا رہی ہے۔

۲۰ جنوری

آج صبح مجھ پہ عجب واردات گزری۔ صبح جب میری آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ سبیلین چپ چاپ افسردہ سی صورت بنائے کسی سوچ میں گم ہے۔ پورے کمرے کی فضا میں اداسی رہی ہوئی تھی۔ یہ وہی کمرہ ہے۔ جہاں منزل اور اجمل دن رات اخبار پہ جتے رہتے تھے اور جہاں بیٹھ کر سبیلین کے قخیل اور زبان دونوں کو پر لگ جاتے تھے کمرے کی اس اداس فضا نے مجھ پہ عجب اثر کیا۔ میرا دل بھر آیا اور آنکھیں بھیگ گئیں۔ یہ کچھ بہت ہی عجیب ہی بات تھی۔ مگر آج کل تو مجھے روز کسی نہ کسی ایسے تجربے سے دوچار ہونا پڑتا ہے جو میری فطرت کے خلاف ہے یا کم از کم جسے میں اپنی فطرت کے خلاف سمجھتا ہوں۔ رونے کو ہمیشہ میں نے اپنی فطرت سمجھا۔ یہ کام میں نے سبیلین کے لیے چھوڑ دیا ہے دراصل رونا نرم گرم طبیعتوں کو مشغلہ ہے۔ سبیلین فطرتاً نرم مزاج ہے یہی وجہ ہے کہ وہ بڑی آسانی سے زمانے سے سمجھوتا کر لیتا ہے۔ جس صورت حال کو وہ تین مہینے پہلے ناقابل برداشت تصور کرتا ہے۔ تین مہینے بعد وہ اس کے لیے قابل قبول بن جاتی ہے۔ اپنی ہر ناکامی میں ہو کوئی تسکین کا پہلو ڈھونڈ نکالتا ہے۔ تحریک کا بالکل پڑا ہو چکا ہے۔ اخبار بند ہو گیا۔ کارکن رخصت ہو گئے۔ آج سبیلین سے یہ صدمہ برداشت نہیں ہوتا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ تین ماہ بعد وہ اس ناکامی کا جواز ڈھونڈ لے گا اور خود فریبی کے لیے پھر سامان پیدا کرے گا۔ مگر مجھ سے یہ نہیں ہوتا۔ میں حالات سے سمجھوتا نہیں کر سکتا۔ یہ حالات کا اثر ہے کہ یہ میری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ ورنہ یہ میری سب سے بڑی طاقت بھی ہو سکتی تھی۔

۲۲ جنوری

آج میں نے پھر اپنے آپ کو رونے پہ مائل پایا اور بغیر کسی وجہ کے بس یونہی جی چاہا کہ خوب روؤں پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔ میں سوچتا ہوں کہ یا اللہ کیا میرے مزاج کی کایا پلٹ جائے گی۔ میری طبیعت میں یہ سوز و گداز آخر کیسے پیدا ہوا۔ کیا واقعی ہر انسان کو زندگی کے کسی نہ کسی موٹ پہ رونے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اتنا تو میں مانتا ہوں کہ بعض لوگوں کی افتاد کچھ اس قسم کی ہوتی ہے کہ رونے سے ان کا جی ہلکا ہو جاتا ہے۔ ان کی روح کی کمزورت دھل جاتی ہے۔ مگر ان لوگوں کی طبیعتوں میں ایک خاص قسم کی گھلاوٹ ہوتی ہے۔ میری طبیعت میں وہ گھلاوٹ نہیں ہے۔ میرے سینے پہ جو ایک بوجھ ہے۔ وہ یوں نہیں ہٹے گا۔ وہ آنسوؤں سے نہیں دھل سکتا۔ مگر یہ غبار کیسے دھلے گا۔ یہ میں نہیں جانتا۔ میری روح میں جو ایک طوفان کروٹیں لے رہا تھا۔ اب اس نے محض ہو کر ایک ریگلتے ہوئے غبار کی شکل اختیار کر لی ہے یہ غبار آنکھوں کی راہ نہیں نکلتے گا۔ اس کے ٹکاس کی جوارہ ہے۔ وہ یا تو میرے بس میں نہیں ہے یا میں اس سے واقف نہیں ہوں۔

۲۳ جنوری

رات مجھے بے تحاشا افسری کا خیال آیا اور اس کے ساتھ ساتھ طبیعت کچھ بہت افسردہ ہو گئی۔ افسری کا جب خیال آتا ہے تو بس یوں معلوم ہوتا ہے کہ اندر سے کوئی چٹکی لے رہا ہے۔ نہ جانے یہ کیا کیفیت ہے۔ یہ محبت کی کیفیت تو یقیناً نہیں ہے مگر میں اپنی ناکامی کا احساس ضرور چھپا ہوا ہے۔ یہ بھی آخر مخالف ہی لگا کہ میں عورت کو شکست دے سکتا ہوں۔ مجھے دنیا کی ہر کمزور طاقت نے شکست دی۔ عورت بھی دنیا کی ایک کمزور طاقت ہے۔

افسری یوں جو کچھ بھی ہو مگر اس کے جسم کو دکھ کر تو بس سبحان اللہ کہنے کو ہی چاہتا ہے۔ اس جسم کے آگے میں نہ تو خود جھک سکا اور نہ اسے اپنے آگے جھکا سکا۔ دراصل محبت پردگی کا معاملہ ہے۔ وہ چیز نہ مجھ میں تھی نہ افسری میں تھی۔ یوں میں جانتا ہوں کہ اسے علق سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔

افسری کے متعلق جب میں سوچتا ہوں تو دل کو کوئی مسئلہ لگتا ہے اور کوئی چپکے چپکے افسردگی آمیز آواز میں کہتا ہے۔ ”زندگی ضائع ہو گئی۔ وقت بیت گیا۔“ زندگی واقعی ضائع ہو گئی۔ وقت بے شک بیت گیا۔

۲۶ جنوری

رفتہ رفتہ میری طبیعت ٹھکانے آرہی ہے۔ میری طبیعت میں جو رقت کا مادہ پیدا ہو چلا تھا۔ اس پہ میں نے قابو پا لیا ہے۔ یوں اب بلاوجہ بلا سبب بیٹھے بٹھائے میرا دل بھر کر نہیں آتا۔ اب دوسری کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔ اب یوں محسوس ہوتا ہے کہ میرا دل ہتھکڑا ہوتا جا رہا ہے۔ آج کل میں منت نئی کیفیتوں سے گزر رہا ہوں۔ یہ کیفیتیں میری سمجھ میں تو آتی نہیں ہیں۔ اللہ جانے مجھے کیا ہوا جا رہا ہے۔

۲۷ جنوری

اس کے گمے پہ دل کی خرابی نہ پوچھئے
گویا کوئی مگر ہو کسو کا لڑکا ہوا

۲۸ جنوری

سینے پہ ایک ٹیلا ابوجہ سار کھا ہے۔ اس کے اثر سے دم بند ہوا جا رہا ہے اور یوں معلوم ہو رہا ہے کہ دل کی نبض ڈوبتی جا رہی ہے۔

۲۹ جنوری

آج ۲۹ جنوری ہے۔ جب مجھے تاریخ یاد آ جاتی ہے تو اطمینان سا ہوتا ہے کہ ابھی وقت کا احساس مجھ میں باقی ہے مگر یہ احساس آخر کب تک باقی رہے گا۔ ذہن کی عجب کیفیت ہے۔ ایک دھند سا اس میں بھرا ہوا ہے بلکہ مجھے تو ساری چیزیں ہی گرد میں آئی ہوئی

معلوم ہوتی ہیں۔ چیزوں کا الگ الگ وجود میرے لیے ختم ہو چلا ہے۔ بس یوں لگتا ہے کہ ذروں کا ایک جلوس ہے جو دھیرے دھیرے چیزوں کو اپنی آغوش میں لے رہا ہے اور آگے بڑھ رہا ہے۔

۳۰ جنوری

نارے میں لوہو رو رو خط کھینچ ڈالے سارے

یہ میر بیٹھے بیٹھے تحریر کیا نکالی

حاضر کا احساس باقی ہے دھندلا دھندلا ہی کسی۔ مگر ماضی کی کڑیاں بالکل گم ہو چکی ہیں۔ آج میں نے اپنی ڈائری الٹ پلٹ کر دیکھی تاکہ کچھ اپنی گزری ہوئی زندگی کا انا پتا چلے۔ میں حیران رہ گیا۔ یہ اتنے بہت سے لفظ کہاں سے آئے؟ کس نے لکھے ہیں؟ میں نے لکھے؟ رونا تو میری فطرت کے خلاف ہے اور ان لفظوں میں جا بجا لہو رونے کے نشان ملتے ہیں۔ نہ رونے والے کیسے کیسے جیب طریقوں سے روتے ہیں اور کتنے غیر محسوس ڈھنگوں سے روتے ہیں۔ لہو رونا اور خط کھینچنا کیا میں عمر بھر یہی کرتا رہا ہوں۔ مگر یہ کیا طور..... میں کہتا کیا چاہتا ہوں چیزیں آپس میں گڈمڈ ہو رہی ہیں۔ یہ میڑھے میڑھے خط۔ یہ میری ڈائری کے اگلے سیدھے لفظ پگھل رہے ہیں آپس میں غلط ملط ہو رہے ہیں۔ لہو روتے ہوئے مرتعش لفظوں کی قطار دھندلی پڑ رہی ہے مٹ رہی ہے۔؟

کچھ یاد نہیں پڑتا کہ آج کیا تاریخ ہے اور کونسا مہینہ ہے۔ ممکن ہے۔ آج کوئی تاریخ نہ ہو اور کوئی مہینہ نہ ہو۔ وقت ختم ہو گیا ہے یا میں اس کے احساس سے محروم ہو گیا ہوں؟ اپنے ارد گرد مجھے ایک میٹا لاغبار منڈلا تا نظر آتا ہے۔ اس میٹا لے غبار میں مجھے یوں دکھائی دے رہا ہے کہ گائے کے دو سینک مطلق ہیں اور ابھی ابھی کوئی مددوری چیز جو ان پنگی ہوئی تھی بیکا بیک غائب ہو گئی ہے۔

وہ ٹھکن جو میرے جسم اور میری روح میں رچ گئی تھی۔ اس کا احساس زائل ہو چلا ہے۔ اب مجھے یوں لگتا ہے کہ میرا جسم پتھر کا ہوتا جا رہا ہے۔ بھورے بھورے ڈراؤنی صورتوں والے بندر مجھ پہ لپک رہے ہیں اور میں انہیں چپ چاپ دیکھ رہا ہوں۔ میری مدافعت کی قوت زائل ہو چکی ہے۔ میرے دھڑکنک کا جسم پتھر کا ہو چکا ہے اور جمود کی کیفیت دھیرے دھیرے اوپر کی طرف بڑھ رہی ہے اور میرے منہ حال ہوتے ہوئے دل کو چھو لینا چاہتی ہے۔ کچھ گہن کی سی کیفیت ہے۔ گہن؟ چاند کو گہن لگ رہا ہے۔ چپ چاپ دھیرے دھیرے۔ میں گہنارہا ہوں یعنی فیاض خاں گہنارہا ہے۔ اس کی روح گہنارہی ہے۔

